BNUR401DET

سر سید احمد خاں

بی۔اے۔(آنرس)

چار سالہ پروگرام

چوتھا سمسٹر (اردو)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

Copyright © 2026, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-68324-28-2
Course : Sir Syed Ahmad Khan
First Edition : August 2026
Copies : 5000
Price : 95/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor (Urdu), CDOE, MANUU, Hyderabad

Editorial Board/Editors

Prof. Nikhath Jahan, Professor Urdu
CDOE, MANUU

Prof. Md Naseemuddin Farees, Urdu Consultant
CDOE, MANUU

Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor
CDOE, MANUU

Dr. Sabir Ali Siwani, Assistant Professor
CDOE, MANUU

Dr. Talath Jahan, Urdu Consultant
CDOE, MANUU

Dr. Md Nehal Afroz, Asst. Prof. (C),
CDOE, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Prof. (C),
CDOE, MANUU

Dr. Mohd Jafar, Asst. Prof. (C),
CDOE, MANUU

Production

Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu),
CDOE MANUU

Mr. P Habibulla
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan,
Assistant Professor (C),
CDOE MANUU

Mohd Abdul Naseer
Section Officer, CDOE MANUU

Shaik Ismail,
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in *Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by Dr. Mohd Akmal Khan, Faculty of Urdu, CDOE, MANUU

Printed at: Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

فہرست

پیغام		وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام		ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف		کورس کوآرڈی نیٹر	7
اکائی نمبر	**اکائی کا نام**	**مصنف**	**صفحہ نمبر**
1۔	سرسید کا عہد اور سیاسی و سماجی حالات	پروفیسر طارق سعید	9
2۔	سرسید احمد خاں کے حالات زندگی	ڈاکٹر ارشاد احمد	28
3۔	سرسید کی ادبی و صحافتی خدمات	ڈاکٹر عبدالقوی	46
4۔	علی گڑھ تحریک	ڈاکٹر محمد شاہد	70
5۔	سرسید کی نثر نگاری کی خصوصیات	ڈاکٹر محمد فرحان خان	84
6۔	سرسید کے مضامین کا تجزیہ (''گزرا ہوا زمانہ'' اور '' امید کی خوشی'')	ڈاکٹر محمد اکمل خان	104
7۔	سرسید کے مضامین کا تجزیہ (''کاہلی'' اور '' خوشامد'')	ڈاکٹر محمد نہال افروز	122
8۔	سفر نامہ مسافران لندن (ایک باب)	ڈاکٹر توصیف بریلوی	135
	نمونہ امتحانی پرچہ		147

مصنفین کی تفصیلات

(Writer's Details)

Prof. Tariq Saeed, Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh	**پروفیسر طارق سعید**، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor (Urdu), Centre for Distance and Online Education, MANUU, Hyderabad	**ڈاکٹر ارشاد احمد**، اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مانو، حیدر آباد
Dr. Abdul Qavi, Assistant Professor (Urdu) Azeem Memorial PG College, Sitapur, Uttar Pradesh	**ڈاکٹر عبدالقوی**، اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)، عظیم میموریل پی جی کالج، سیتاپور، اتر پردیش
Dr. Mohd Shahid, Pandit Deen Dayal Upadhyaya Government Model Inter College, Etah, Uttar Pradesh	**ڈاکٹر محمد شاہد**، پنڈت دین دیال اُپادھیائے گورنمنٹ، ماڈل انٹر کالج، ایٹہ، اتر پردیش
Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor (C), Centre for Distance and Online Education, MANUU, Hyderabad	**ڈاکٹر محمد اکمل خان**، اسسٹنٹ پروفیسر (C)، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد
Dr. Md. Nehal Afroz, Asst. Professor (C), Centre for Distance and Online Education, MANUU, Hyderabad	**ڈاکٹر محمد نہال افروز**، اسسٹنٹ پروفیسر (C)، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد
Dr. Mohd Farhan Khan, Resource Person, Urdu, Teaching and Research Centre, Solan, Himachal Pradesh	**ڈاکٹر محمد فرحان خان**، ریسورس پرسن، اردو، ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سولان، ہماچل پردیش
Dr. Tauseef Khan (Tauseef Barelvi), Dept of Urdu, Al-Barkaat College of Graduate Studies, Aligarh	**ڈاکٹر توصیف خان (توصیف بریلوی)**، شعبہ اردو، البرکات کالج آف گریجوئٹ اسٹڈیز، علی گڑھ

ٹائٹل پیج (Title Page):

ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ A+ حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد میں اردو زبان کا فروغ، پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا وغیرہ اہم ہیں۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 500 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری / گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات و اطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہو گا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم و تدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو / ہندی / انگریزی / عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self-Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل بیس (20) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم (نظامت فاصلاتی تعلیم)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے طلبا کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر اردو زبان و ادب کی تاریخ کے موضوع پر درسی مواد تیار کیا ہے۔ یہ مواد چار سالہ بی۔ اے۔ پروگرام کے پہلے سمسٹر کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبا کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یو جی سی کی اسی ہدایت کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا ہے۔ یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی۔ موجودہ تعلیمی ضرورت کے پیش نظر این ای پی 2020 (NEP-2020) کے تحت اردو طلبا کے لیے خود اکتسابی مواد تیار کیا جارہا ہے۔ یہ مواد چار سالہ (آٹھ سمسٹر) کورس کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، جس کی تیاری میں ملک بھر کے مختلف جامعات اور تعلیمی اداروں کے ماہر اساتذہ اپنا تعاون کر رہے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے نہ صرف اردو طلبا کی ضرورت کی تکمیل ہو گی بلکہ اردو داں طبقے کے لیے بھی یہ مواد قدر مفید ثابت ہو گا۔

نئے نصاب کی تیاری میں مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم کی موجودہ کتب میں دستیاب مطلوبہ مواد کو ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور نئے نصاب کے تقاضوں کے پیش نظر نئی اکائیاں بھی لکھوائی گئی ہیں جو کورس کے خود اکتسابی مواد کا حصہ بنی ہیں۔

اس کتاب میں مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی ہے جو یکساں نصاب کے تحت روایتی اور فاصلاتی تعلیم دونوں کی ضرورتوں کو بیک وقت پورا کر سکے۔ ہر اکائی کے تحت موضوع سے متعلق مواد کے علاوہ' اکتسابی نتائج، کلیدی الفاظ، نمونۂ امتحانی سوالات اور تجویز کردہ اکتسابی مواد کی فہرست بھی دی گئی ہیں۔ امید ہے یہ معلومات طلبا کے لیے بے حد معاون ہوں گی۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم چار سالہ بی۔ اے۔ کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ چوتھے سمسٹر کے اس پرچے کا عنوان 'سرسید احمد خاں' ہے۔ اس پرچے میں کل آٹھ اکائیاں ہیں۔ یہ پرچہ سرسید احمد خاں کے تمام اکتسابی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جس میں سرسید کے عہد، ان کے حالات زندگی، ان کی ادبی اور صحافتی خدمات اور ان کے چند اہم مضامین اور سفر نامہ سے متعلق تفصیلی مواد پیش کیا گیا ہے۔

انہیں باتوں کے ساتھ اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی بیش قیمت آرا ہمیں اس کتاب کو مزید بہتر، کارآمد اور مفید بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد
کورس کوآرڈی نیٹر

سر سید احمد خاں

اکائی 1 : سرسید کا عہد اور سیاسی و سماجی حالات

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 سرسید سے قبل کے سیاسی اور سماجی حالات

1.3 غدر کے بعد کی سیاسی صورت حال

1.4 سرسید کا سیاسی شعور

1.5 سرسید کی سماجی دردمندی

1.6 سرسید کے معاصر فکری رویے اور اصلاحی تحریکات

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 کلیدی الفاظ

1.9 نمونہ امتحانی سوالات

1.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

سرسید احمد خاں (1817- 1898ء) کے ایک ایسے عہد میں آنکھیں کھولیں جو انتشار، انقلاب اور عبوری دور تھا۔ یہ عہد مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے استحکام کا عہد تھا۔ اس درمیان ملک کا سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظام ناگفتہ بہ تھا۔ ہندوستانی عوام تشکیک، وہم اور خوف کے سایے میں زندگی گزار رہی تھی، نتیجتاً اس کے اندر بیجا راہ و رسم، بدعت و رسومات نے گھر کر لیا تھا اور یہی ان کی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زوال کا پیش خیمہ تھا۔ چوں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہو کر مسلمانوں سے حکومت غصب کی تھی، یہی وجہ ہے کہ انگریز اُن کو دیگر مہذب قوموں کے مقابلے سب سے بڑا دشمن گردانتے تھے اور مظالم و مصائب کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ہندوستانی عوام علمی و ادبی اور معاشی اعتبار سے پستی و ذلت کا شکار ہو گئی۔ جب ہندوستانی اقوام کی معاشی ترقی میں رخنہ پڑا تو وہ کئی حصوں میں منقسم ہو گئی۔ اس نے اپنے اپنے طور پر مذہبی روایات میں تبدیلیاں کر لیں اور غلط راہ پر چل نکلے، انھوں نے اپنی لاعلمی کے سبب مذہب کی تقلید اور بے جا رسوم و قیود کو اصل مذہب تسلیم کر لیا اور اس طرح اخلاقی طور پر بری طرح مجروح ہو گئی۔ سیاسی اتھل پتھل

نے اس کو قوم کے دھارے سے کاٹ کر رکھ دیا، اس کا کوئی راہنما اور قائد نہ بچا جس کے سبب بے عملی، جمود اور سستی و کاہلی اس کی شناخت بن گئی تھی۔ ایسے پُر آشوب دور میں سرسید جیسی عبقری شخصیت نے جنم لیا۔

سرسید' انیسویں صدی کے برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے عظیم علمبر دار کے طور پر ابھرے۔ انھوں نے ہندوستانی سیاسی حکمت عملی کی بناڈالی اور اس کے لیے لائحہ عمل طے کیا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے 1837ء میں آگرہ میں کمیشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی کے فرائض انجام دیے۔ 1857 کی شورش میں وہ خود حکومت کے اہم عہدے پر فائز تھے لہٰذا ان سارے ہنگاموں کے وہ چشم دید تھے، جن کا انھوں نے مشاہدہ اور تجربہ کیا اور ملک و قوم کی ترقی کے لیے عملی اقدام کیے۔ انھوں نے انگریزوں سے مصالحت و مفاہمت کا رویہ اپنا کر سیاست کے مثبت رخ کو مسلمانوں کی طرف موڑا۔ اس کے بعد بڑی بر دباری سے مذہبی، سیاسی، تاریخی، تحقیقی، تنقیدی اور تفسیری کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے تعلیم کے تئیں بیداری کی تحریک پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کر کے مسلمانوں کو جہالت کے قعرِ مذلت سے نکالنے اور انھیں باعزت قوم بنانے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ سرسید کی بدولت ہی ہم انیسویں صدی کے ربع آخر کو مسلم قوم کے لیے ایک انقلابی عہد کا نام دے سکتے ہیں، جس میں زندگی کے مختلف گوشوں اور ہندوستانی معاشرے میں کئی معنی خیز تغیرات ہوئے۔ یہ سارے اقدامات در حقیقت ایک فرد کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہیں، جسے ہم ہندوستانی نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- سرسید سے قبل کے سیاسی اور سماجی حالات سے واقف ہو سکیں۔
- سرسید کے سیاسی شعور سے آگاہی حاصل کر سکیں۔
- سرسید اور ان کے عہد کی سیاسی اور سماجی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔
- سرسید کے عہد کی اصلاحی تحریکات سے بہرہ ور ہو سکیں۔

1.2 سرسید سے قبل کے سیاسی اور سماجی حالات

اٹھارہویں صدی میں ہی مغلیہ حکومت کی بنیادیں نمایاں طور پر متزلزل ہو چکی تھیں۔ دہلی کی بساط محض ایک کٹھ پتلی یا شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات (1707) اور بہادر شاہ ظفر کی معزولی و جلاوطنی (1857) کے درمیان کا ڈیڑھ صدی پر محیط زمانہ مغلیہ حکومت کے حق میں بہت ہی پر آشوب ثابت ہوا، سلطنت کی ساری بساط الٹ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اندرونی خلفشار نے طاقتور امراء کو شہ دی اور انہوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے دہلی حکومت سے رشتہ استوار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ روہیلے، مرہٹے، جاٹ، سکھ سب ہی منحرف ہو چکے تھے۔ پالم، دکن، اودھ بنگال کے صوبے دار حکمراں بن بیٹھے تھے۔

ہندوستان کے سیاسی انتشار اور دگرگوں حالات کو دیکھ کر سب سے پہلے ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ نادر شاہ نے 1739 میں کرنال کے میدان میں مغل فوج کو شکست دی اور فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔ اس نے شہر میں قتل عام شروع کر دیا اور مغل بادشاہ، امرا اور رئیسوں کی دولت لوٹ لی۔ وہ تخت طاؤس اور کوہِ نور ہیرے کے علاوہ کروڑوں لوٹ لے گیا۔ جب وہ واپس ہوا تو محمد شاہ نے سندھ کا علاقہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ نادر شاہ کے حملے سے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں ہل گئیں۔ حکومت مالی اور فوجی اعتبار سے بہت کمزور ہو چکی تھی، پھر بھی ہندوستان میں مغل شہنشاہ کا وقار بڑی حد تک باقی رہا۔ اب بھی بڑے بڑے صوبے دار مغل شہنشاہ کو ہی اپنا آقا تسلیم کرتے تھے۔ ایک صوبے دار کی موت کے بعد اس کا بیٹا یا اس کا قریبی رشتے دار شہنشاہ کے دیئے ہوئے خطاب اور فرمان کی بدولت صوبے پر حکومت کرتا تھا۔ اور اس کے لیے وہ شہنشاہ کو کثیر رقم اور تحائف پیش کرتا تھا۔ لیکن 1747 میں محمد شاہ کے انتقال کے بعد مغل شہنشاہ کا بچا ہوا وقار بھی ختم ہو گیا۔ دہلی میں ایرانی اور تورانی کی باہمی مخالفت کی وجہ سے صوبے آہستہ آہستہ خود مختار ہونے لگے اور دہلی تباہ و برباد ہو گئی۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے کے دو سال بعد مرہٹوں نے لال قلعے پر حملہ کیا اور دیوان خاص سے چاندی کی چھت اور رنگ محل سے قیمتی پتھر چرا لیے۔ مرہٹوں کے بعد دہلی کے قرب وجوار کے علاقوں کو جاٹوں اور سکھوں نے لوٹا۔ 1761 میں مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی، جس میں احمد شاہ ابدالی کو فتح نصیب ہوئی اور ہندوستان میں مرہٹوں کا اثر ختم ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو نجیب الدولہ کے حوالے کر دیا اور 1770ء تک نجیب الدولہ نے شاہ عالم کے نام پر دہلی پر حکومت کی۔ اس دوران شاہ عالم الہ آباد اور بہار میں رہا۔ نجیب الدولہ کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد دہلی دوبارہ آباد ہونا شروع ہوئی۔ دہلی کو آباد کرنے میں دہلی کے بااثر بزرگوں نے بھی نجیب الدولہ کا تعاون کیا جن میں مظہر جان جاناں، حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹے عبد العزیز شامل تھے۔ نجیب الدولہ نے وسائل کے محدود ہونے کے باوجود ایک مضبوط فوج بنائی اور اس کے تعاون سے دہلی سے سہارنپور تک قبضہ کر لیا اور ہر جگہ امن قائم ہو گیا۔ پھر اس نے سورج مل جاٹ کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی۔ اس کے علاوہ جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کا بھی مقابلہ کیا۔ لیکن 1770 میں نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد دہلی پھر سے مصائب کا شکار ہو گئی۔ کیونکہ اس کا بیٹا ضابطہ خان نااہل تھا۔ 1772 میں شاہ عالم دوبارہ دہلی میں مرہٹوں کی مدد سے داخل ہوا لیکن اس نے حکومت کی باگ ڈور نجف خاں کے حوالے کر دی اور خود عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا۔ نجف خان ایک قابل فوجی جنرل تھا۔ اس نے دہلی کے اطراف وجوانب میں امن و سکون قائم کرنے کے بعد آگرہ پر حملہ کیا اور آگرہ کو جاٹوں سے آزاد کرا لیا۔ اس طرح مغل سلطنت کے دونوں قدیم مراکز دوبارہ حاصل ہو گئے۔ لیکن نجف خان نے عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر اپنی صحت خراب کر لی اور پھیپھڑوں کے خراب ہونے کی وجہ سے 45 سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ نجف خان کی موت سے دہلی مین امن وامان کا خاتمہ ہو گیا۔ دہلی کو خانہ جنگی سے نجات دلانے کے لیے شاہ عالم نے سندھیا کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1785 میں شاہ عالم نے دہلی اور دوآبہ کی حکومت سندھیا کے سپرد کر دی۔ اس کے عوض میں سندھیا نے شاہ عالم کے لیے ساڑھے چھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن یہ رقم کبھی بھی پوری ادا نہیں ہوئی جس کی وجہ سے بادشاہ اور سلاطین کو تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا۔

1788 میں غلام قادر، نجیب الدولہ کے پوتے دہلی پر قابض ہوئے۔ اس نے مرہٹوں سے شمالی ہندوستان آزاد کرانے کے لیے شاہ

عالم سے روپیہ طلب کیا۔ لیکن شاہ عالم نے اس کی مدد کرنے کے بجائے سندھیا سے خفیہ طور پر مدد مانگی۔ اس بات کی خبر جب غلام قادر کو ہوئی تو اس نے غصے میں آکر شاہ عالم کو اندھا کر دیا اور قلعے کی ساری دولت لوٹ لی۔ اس کے کچھ عرصے بعد سندھیا نے غلام قادر کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ لیکن سندھیا کے دورِ اقتدار میں بھی بادشاہ کی حالت پسپا رہی۔

1803 میں دہلی اور اس سے وابستہ علاقوں میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اس سال انگریزوں نے جنرل لیک کی قیادت میں مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی اور اس سے متعلق علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ مغل بادشاہ شاہ عالم نے جنرل لیک کا استقبال کیا۔ 16/ ستمبر 1803 میں جنرل لیک نے شاہ عالم کے دربار میں حاضری دی۔ اب تک ہندوستان میں مغل بادشاہ کا کافی وقار تھا۔ لارڈ ویلزی نے شاہ عالم کی ہر ممکن رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک معاہدہ کیا جس میں بادشاہ اور سلاطین کے لیے ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ مقرر کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ کمانڈر انچیف کی طرف سے سالانہ پیش کش بھی دی جائے گی۔ شاہی باغات اور دہلی کے اطراف دیہات کی آمدنی بھی بادشاہ کی جاگیر مان لی گئی۔ قلعہ معلی اور اس کے بازار کو انگریزی حکومت کی دخل سے آزادر کھا گیا۔ دہلی سے متعلق علاقوں میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالتوں میں قاضی اور مفتی مقرر کیے گئے تاکہ جو قانون رائج ہے اس کے مطابق نظم وضبط بنا رہے۔

1806 میں شاہ عالم کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد حکومت میں انگریزوں نے بادشاہ کا وظیفہ ساڑھے گیارہ لاکھ سے بڑھا کر بارہ لاکھ کر دیا۔ یہ سارے واقعات دھیرے دھیرے تمام ہندوستانیوں کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ دہلی اوراس کے اطراف وجوانب میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد کچھ مدت تک امن وامان قائم رہا۔ انگریزوں نے علاقے کی خوش حالی بڑھانے میں دلچسپی لی اور تھوڑے ہی مدت میں دہلی پھر سے ایک تہذیبی اور تجارتی مرکز کی حیثیت سے ابھرنا شروع ہوئی اور پورے علاقے میں زراعت کی بھی ترقی ہوئی۔ جو دیہات قحط کی وجہ سے غیر آباد ہو گئے تھے، پھر سے آباد ہو گئے، ان تمام خوشگوار تبدیلیوں کے باعث شاہ جہاں آباد کی آبادی میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا، ہندوستانی مصنوعات میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ ہندو اور مسلم سوداگر وسط ایشیا کے ملکوں کا سفر کرنے لگے جہاں پر وہ اپنا مال فروخت کر کے واپسی پر ریشم اور گھوڑے ہندوستان لاتے تھے۔ اس تجارت کے باعث دہلی میں دولت کی فراوانی ہوئی۔ دہلی اوراس کے آس پاس کے شہروں میں یورپ کی تیار کی ہوئی اشیا کی کھپت بہت کم ہو گئی۔ کیونکہ یہ اشیا کلکتہ سے کشتی کے ذریعے دہلی اور آگرہ لائی جاتی تھیں اور گھوڑوں پر لاد کر دوسری جگہ بھیجی جاتی تھیں۔ ان پر کرایہ بہت زیادہ خرچ ہوتا تھا جس کی وجہ سے ان اشیا کی قیمتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی دہلی کی بنی ہوئی اشیا اعلیٰ قسم کی ہونے کی وجہ سے لوگ دہلی کی بنی ہوئی چیزوں کو ترجیح دیتے تھے۔ یورپ کی مصنوعات میں سے صرف شراب کو ہی لوگ پسند کرتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کو کبھی بھی موقع نہیں دیا کہ وہ پارلیمنٹ میں جا سکیں اور اپنی پریشانی کا اظہار کر سکیں۔ اس لیے وہ ہندوستانیوں کی تکلیف اوران کے جذبات کو نہیں سمجھ سکے۔ اس کی وجہ سے دونوں طرف بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ اسی دوران سور کی چربی سے بنے ہوئے کارتوس کا قصہ سامنے آیا جس کی وجہ سے فوج میں بے اطمینانی اور بے چینی حد سے زیادہ بڑھ گئی اورانہیں یقین ہو گیا کہ برطانوی حکومت ہمارے مذہبی عقائد اور ایمان کو خراب کرنے پر تلی ہے۔

دہلی میں مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت صرف لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اوران کی آمدنی صرف انگریزوں پر ہی منحصر تھی۔ بادشاہ کی کوئی حیثیت نہ تھی مگر اس کے باوجود عوام ان کو اپنا بادشاہ مانتے تھے۔ میرٹھ سے کوچ کرنے والی فوج 11 / مئی کو جب دہلی پہنچی تو دہلی میں وہ لوگ جو انگریزوں کے ستائے ہوئے تھے اوران سے نفرت کرتے تھے ان کے خلاف لڑائی میں شامل ہوگئے اور باغی فوج لال قلعے کے پاس جمع ہوگئی اور بہادر شاہ ظفر سے قیادت سنبھالنے کو کہا۔ بہادر شاہ ظفر کو اپنی کمزوری کا بخوبی علم تھااس لیے وہ انگریزوں کے خلاف کسی بھی طرح کی جنگ نہیں چاہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے ہر چند منع کرنے کے باوجود باغی فوج اسے ماننے کو تیار نہ تھی۔ لہٰذا بہت سوچنے سمجھنے کے بعد بہادر شاہ ظفر نے باغیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور قیادت سنبھالی۔ قیادت سنبھالنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ فوج کے نظم ونسق کا تھااوراس کے لیے مالی تعاون کی سخت ضرورت تھی مگر شاہی خزانہ خالی تھا۔ اس کے حل کے لیے بینکوں کے مالکوں کو قلعہ میں قید کیا گیااور سرکاری خزانے میں روپے دینے کو کہا گیا۔ اس طرح سے ایک لاکھ روپیے اکٹھا ہوئے لیکن یہ پیسہ کافی نہیں تھا۔ باغی فوج کو کنٹرول کرنے کے لیے بادشاہ نے مرزا مغل کو کمانڈر انچیف مقرر کیا لیکن وہ اس میں ناکام رہے اور حالات کو قابو میں نہیں کر سکے اور بدامنی بڑھتی گئی۔ کچھ لوگ عیسائیوں کو تلاش کرنے کے آڑ میں امیروں کو لوٹنے لگے۔ ان حالات کو دیکھ کر بازار میں لوگوں نے اپنی اپنی دکانیں بند کر دیں تاکہ لوٹ سے بچا جاسکے۔ بادشاہ نے جب شہر کی ایسی بدتر حالت دیکھی تو خود ہاتھی پر سوار ہو کر بدامنی کو دور کرنے کے لیے گشت کیا اور انھیں یقین دلایا کہ ہم ہر طریقے سے آپ لوگوں کے ساتھ ہیں لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ دوسری طرف انگریزوں کی طرف سے فوج کے کمانڈر انچیف جنرل اینسن تھے۔ انہوں نے باغیوں سے نپٹنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ وہ پہلے کرنال آئے تاکہ یہاں سے دلی جانے میں آسانی ہو لیکن راجدھانی پہنچنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ گرمی بہت تھی۔ ان کی فوج کو لُو اور تپش میں لڑنے کی مشق نہ تھی لہٰذا لو اور تپش میں ہیضے کی وجہ سے بہت سے فوجی مر گئے۔ خود کمانڈر انچیف بھی ہیضے سے مر گئے۔

اینسن کی موت کے بعد سر ہنری برنارڈ نے باغیوں سے لڑنے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر ایک منصوبے کو ترتیب دیا جس کے تحت برگیڈیر ولسن کی قیادت میں ہندندی کے پاس باغیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد دلی سے پانچ میل دور بادلی کی سرائے میں انگریزوں نے باغیوں کو شکست دی اور فتح حاصل کرنے کے بعد آگے دہلی کی طرف بڑھے اور دلی کی بیرونی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیااور کئی روز تک جنگ چلتی رہی۔ اس دوران 2 / جولائی کو بریلی کی فوج بخت خان کی سربراہی میں دلی پہنچی۔ بادشاہ نے مرزا مغل کی جگہ بخت خان کو کمانڈر انچیف بنا دیا۔

دونوں طرف کی فوجیں بہادری کے ساتھ لڑتی رہیں۔ لیکن انگریزوں کو خفیہ طریقے سے باغیوں کی پوری خبر ملتی تھی جس کا فائدہ انگریز اٹھاتے۔ انھیں اپنے جاسوسوں سے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ دیسی فوج تنخواہ کے لیے ہنگامہ کر رہی ہے اور بھاگ رہی ہے اور انگریزی حکومت میں دوبارہ شامل ہونا چاہتی ہے۔ اس لیے ان کا حوصلہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ ادھر بقر عید کے موقع پر ہندو مسلمان میں فساد ہونے کا بھی ڈر تھا۔ اس لیے بادشاہ نے ہندواور مسلم اتحاد کو بنائے رکھنے کے لیے یہ حکم دیا کہ کوئی بھی مسلمان گائے کی قربانی نہیں کرے گا اوراگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ بقر عید کی نماز کے بعد بادشاہ نے خود بھیڑ ذبح کی اور ہر طرح سے امن وامان اور اتحاد کو بنائے رکھنے کے کی کوشش کی۔ باغی فوج بہادری کے ساتھ لڑتی رہی لیکن بار بار کی شکست سے سپاہیوں کی خود اعتمادی کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کے برعکس انگریزوں کے حوصلے بلند تھے۔ انجام کار انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بہادر شاہ ظفر اور شہزادوں کی گرفتاری

کے بغیر انگریزوں کی کامیابی نامکمل تھی۔ بادشاہ مہرولی چلے گئے تھے لیکن مرزاالٰہی بخش نے غداری کی اور بادشاہ کو ہمایوں کے مقبرے میں لے گیا۔ برطانوی جاسوس رجب علی نے ہڈسن کو مطلع کر دیا اور میجر ہڈسن نے 21/ ستمبر کو ہمایوں کے مقبرے پہنچ کر بہادر شاہ ظفر اور شہزادوں کو گرفتار کر لیا۔ اور بڑی بے رحمی سے تینوں شہزادوں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر کو گولی ماردی گئی۔ اس کے علاوہ مغل خاندان کے اور 21 شہزادوں کو قتل کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کو قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ بہت ظالمانہ سلوک کیا گیا اور انہیں مجرموں کی طرح رکھا گیا۔ وقت گزاری کے لیے بہادر شاہ ظفر شعر وشاعری میں مصروف رہتے اور قید خانے کی دیوار پر شعر لکھتے۔ وہ اتنے بے بس اور لاچار تھے پھر بھی انگریزوں کو ان سے ڈر تھا اس لیے انہوں نے ان کو رنگون بھیج دیا۔

1.3 غدر کے بعد کی سیاسی صورت حال

ہندوستان کے دانشور طبقے نے غدر 1857 کو قومی بغاوت اور آزادی کی پہلی جنگ قرار دیا ہے۔ جبکہ انگریزوں نے اسے غدر کے نام سے یاد کیا ہے۔ وقتی طور پر تو بغاوت ناکام ہو چکی تھی لیکن انگریز اس سے خوف زدہ تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک نئی چال چلنی شروع کر دی۔ اس کے لیے انہوں نے جاگیر دار، زمیندار اور اعلیٰ طبقے کو اپنی طرف کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ لیکن اکثریت نچلے طبقے کی تھی، اعلیٰ طبقہ بہت ہی مختصر تھا۔ نچلے طبقوں کو نظر انداز کرنے کی غلطی مسلسل کرتے رہے جس کے نتیجے میں ایک قومی تحریک سامنے آئی۔ حکومت صاف طور پر امتیاز برتتی۔ اچھی ملازمتوں سے متوسط طبقہ محروم رہتا۔ ہندو مسلم اختلاف، گورے، کالے کا بھید اور نسلی امتیازات وغیرہ پھیلانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستانی عوام کو یہ یقین دلایا کہ ہم ان کا اسی طرح خیال رکھیں گے اور ان کی عزت، حقوق اور وقار کا اسی طرح پاس رکھیں گے جیسے کہ یہ ہمارے اپنے ہوں۔ لیکن یہ سب ایک چال تھی دھوکہ تھا۔ انگریزوں نے وعدے کے مطابق کبھی کام نہیں کیا۔ انگریزوں کی ہر پالیسی کے آگے زمیندار اور ساہوکاروں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور پورا ہندوستان غلام ہو گیا۔ جب بھی مخالفت ہوتی اس کو دبا دیا جاتا اور اس کام میں انگریز بھی زمینداروں کے ساتھ تھے۔ حد سے زیادہ ظلم وجبر ہونے کے سبب عوام کی آنکھیں کُھل گئیں۔ برطانوی حکومت عوام میں بدامنی اور انتشار پھیلا کر اپنے لیے ہی مصیبت کھڑی کر رہی تھی۔ اعلیٰ طبقہ تو بہت ہی کم تھا۔ اس لیے وہ انگریزوں کی خوشامد کیا کرتا تھا لیکن ایک بڑی تعداد نچلے طبقے کی تھی جس میں مزدور، کسان وغیرہ تھے ان کو برابر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس لیے ہندوستانی عوام انگریزوں سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آخر کار عزت وآبرو کی زندگی جینے کا اور انگریزوں کو اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

دھیرے دھیرے ایک نیا طبقہ بھی وجود میں آنے لگا تھا اور یہ طبقہ حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لائق تھا اور مغربی وسائنسی علوم سے واقف بھی تھا۔ یہ طبقہ نمائندہ حیثیت کا مالک تھا۔ اسے نظر انداز کر کے تو کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ انگریزوں کی یہی بھول اور غفلت کا نتیجہ ایک قومی تحریک کی شکل میں سامنے آیا۔ مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ اب سنبھل چکا تھا۔ اسے انگریزوں کی نیت اور حکومت کی چالوں کا بخوبی علم ہو چکا تھا۔ اس درمیان کئی قحط بھی پڑے جس کی وجہ سے عوام مزید ہوش میں آئے۔ اور پورے جوش وخروش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف محاذ تیار کرنے لگے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔ بیسویں صدی میں موہن داس کرم چند گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، کمال اتاترک اور جواہر لال نہرو وغیرہ عظیم سیاسی رہنما سامنے آئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے ہندوستانی قوم پرستوں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ ہندوستانیوں کو اہم سرکاری ملازمتیں دی جائیں۔ اس کے لیے 1823 کے چارٹر ایکٹ کو پیش کیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ بلا کسی تفریق مذہب و ملّت، رنگ و نسل ساری نوکریاں ہندوستانیوں کو بھی دی جائیں گی اور اس کے ساتھ ہی 1857 میں ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کو بھی پیش کیا گیا جس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ سرکاری ملازمت ہندوستانیوں کو ان کی قابلیت کے بنا پر عطا کی جائے گی۔ لیکن لارڈ لٹن اور لارڈ کرزن کی پالیسیوں نے رنگ و نسل کی بنیاد پر ہندوستانیوں سے تفریقی سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں کانگریس کی طرف سے ہندوستان میں انٹلی جنس ادارے قائم کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ تاکہ ہندوستانیوں کی آواز برطانوی حکومت تک ان کے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعے پہنچے۔ 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ اس کے قائم کرنے کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی ایک ایسی سیاسی نمائندہ جماعت قائم کی جائے جو ملک کے حکومتی نظام اور سیاسی معاملوں کے بارے میں ہندوستانیوں کے خیالات اور نظریات کو حکومت کے سامنے پیش کر سکے۔ شروعات میں کانگریس کا مطالبہ سرکاری ملازمتیں اور مختلف شکایتوں کو دور کرنے کا تھا۔ لیکن بعد میں اس کے مطالبے کا رنگ بدل گیا۔ اب یہ خود اختیاری کی طلب گار تھی۔ کانگریس میں کچھ مسلمان بھی تھے لیکن ابتدائی دنوں میں سرسید کے زیرِ اثر وہ اپنی کاوشوں کو زیادہ تر تعلیم اور معاشرتی اصلاح پر ہی مرکوز کیے رہے۔

انڈین کاؤنسل ایکٹ کے تحت جب حکومت برطانیہ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ اب ہندوستان میں اور زیادہ نمائندہ طرز کی حکومت کی طرف مائل ہے تو مسلمانوں کو بھی سیاسی میدان میں آنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ تعلیمی ترقی اور سماجی اصلاح کے علاوہ بھی ان کے مسائل ہیں جو سیاسی دائرہ عمل میں آتے ہیں۔ اس لیے سیاست سے دور رہنا مناسب نہیں۔ اس طرح مسلمان بھی مختلف جماعتوں سے جڑ کر ملکی سیاست میں عملی طور پر شامل ہو گئے۔

1.4 سرسید کا سیاسی شعور

سرسید نے انیسویں صدی کی سیاسی و سماجی صورت حال کو اپنی آنکھوں سے بغور دیکھا تھا اور اس کے اثرات بھی قبول کیے تھے۔ حالاں کہ آپ کی ابتدائی تعلیم روایتی اور مشرقی طرز پر ہی ہوئی تھی اور آپ کے گھرانے پر مذہبی اثرات پوری طرح موجود تھے۔ خود آپ کے والد قلعہ معلی سے وابستہ تھے اور وظیفہ و خلعت مقرر تھا، جو آپ کے والد کے بعد سرسید کو پہنچتا تھا۔ لہٰذا سرسید کھلی آنکھوں سے مسلم قوم کی صورت حال، قلعہ معلی کی حالت زار اور ہندوستانی نظام سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس کے ساتھ انگریزوں کی تمام سرگرمیوں سے بھی مطلع تھے اور اس کے مثبت و منفی اثرات پر غور و خوض کر رہے تھے۔ وہ موجودہ حالات سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئے کہ انھوں نے ملک سے ہجرت کرنے تک کا ارادہ کر لیا، لیکن جب انھوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی تو ادارک ہوا کہ ملک چھوڑنا مسئلے کا حل نہیں ہے اور عزم مصمم

کر لیا کہ اب انھیں یہیں رہ کر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنی ہے۔ چوں کہ ان کا ذہن کشادہ اور روشن تھا لہٰذا انھوں نے تنگ دامنی کے بجائے فراخ دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ہر فکر کا گہرائی سے جائزہ لیا اور حقیقت ان پر پوری طرح واضح ہو گئی تھی۔ مذہبی امور میں بھی ان کے سامنے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات تھیں نیز وہ عربی، فارسی، طب، قرآن، حدیث، فقہ اور اس کے اصولوں کا علم حاصل کر چکے تھے۔ امام غزالی کی عقلیت اور استدلالیت کو انھوں نے بڑی حد تک قبول بھی کیا تھا۔ اسی طرح ہندو قوم میں انہیں آریہ سماج کے طرز معاشرت نے متاثر کیا تھا، جہاں ایک بہتر سماج موجود تھا۔ وہ انگریزوں کے بنائے ہوئے تعلیمی نظام کا بھی مشاہدہ و مطالعہ کر رہے تھے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام اور اس کی تشکیل و تعمیر کے سلسلے سے واقف ہو رہے تھے۔ وہ مسلسل اس امر پر غور کر رہے تھے کہ وہ کون سی وجوہات ہیں یا ایسی خوبیاں ہیں جن کے دم پر ایک قوم دوسری قوموں پر حاوی ہو رہی ہے اور وہ کون سے اسباب اور خامیاں ہیں جن کے ذریعہ ایک قوم مسلسل زوال کا شکار ہے۔ سرسید کا ذہن مسلسل تقابلی عمل سے گزر رہا تھا اور مسلسل غور و فکر میں تھا، جس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ محض 21 برس کی عمر میں جب آپ کے والد کا 1838 میں انتقال ہوا تو سرسید نے سیاسی حالات کے پیش نظر اور دوراندیشی و دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مغل دربار سے وابستگی اختیار کرنے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ حالاں کہ مشرقی مزاج کا دلدادہ ان کے خاندان اور سارے افراد نے ان کے اس عمل کی مخالفت کی مگر انھوں نے عزم مصمم کر کے اپنے فیصلہ کو برقرار رکھا۔ 1839 سے 1857 تقریباً 18 برسوں تک ان کی مختلف عہدوں پر ترقی اور تقرری ہوئی اور اس دوران انھوں نے مختلف علوم و فنون پر دسترس حاصل کی جس کا ذکر مندرجہ بالا سطروں میں ہو چکا ہے۔ اس عہد اور اس عرصہ کو ہم دو قوموں، دو ملکوں، دو تہذیبوں، دو حکومتوں اور قدیم و جدید کا تصادم بھی کہہ سکتے ہیں، جہاں عوام، معاشرہ اور ہر فرد انفرادی طور پر ایک خاص کشمکش اور اضطراب سے دوچار تھا۔ جہاں سائنسی ایجادات، صنعتی ترقیوں اور علوم جدیدہ کی چکاچوند نے پوری دنیا کے ہوش اڑا رکھے تھے، لہٰذا ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ مگر بغور معائنہ کریں تو یہ دور درحقیقت اشتراک اور امتزاج کا بھی دور تھا۔ اور اس اشتراک و امتزاج میں زبانیں اور علم کی مختلف سطحیں بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ سرسید اسی اشتراک اور امتزاج کا ایک نمائندہ حصہ تھے۔ انھوں نے اپنی تہذیب و ثقافت، اپنی زبان اور مذہب کو باقی رکھتے ہوئے مغرب کے ان اثرات کو اپنایا جو انسانی ترقی اور قوموں کی ترقی کے لیے بے حد ضروری اور اہم تھے، جن کے بغیر انسانی وجود محض بیکار اور خالی ہو کر گمنام ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی تعلیم کے فروغ کو انیسویں صدی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی علوم کی آمد اور انگریزی تعلیم نے ہندستان میں نئے رجحانات اور افکار کو عام کیا۔ ہندوستانی علوم نے شروع میں اس کے خلاف آواز بلند کی اور ایک خاص قسم کے تہذیبی و تعلیمی تصادم کی صورت نمودار ہوئی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ لوگ سمجھنے لگے کہ ان علوم کی تحصیل کے بغیر ہم ترقی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس طرح عوام خود بخود اس جانب مائل ہونے لگی۔ ایسی صورت میں تعلیم یافتہ افراد نفسیاتی طور پر خود میں احساس برتری کا جذبہ پانے لگے اور غیر تعلیم یافتہ کو خود سے کمتر سمجھنے لگے۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ انگریزوں کے خلاف فوج کشی سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ کیوں کہ انگریزوں میں ایک ترقی یافتہ قوم کی تمام خصوصیات موجود تھی۔ وہ جدید علوم، ٹیکنالوجی اور جنگی اسلحہ میں ہم سے برتر تھی اور جدید تقاضوں کا واضح تصور رکھتی تھی۔ سرسید کو اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آیا کہ انگریز حکومت کے زیر تسلط مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی

کوشش کی جائے۔ اس کے لیے سرسید نے مندرجہ ذیل حکمت عملی اختیار کی۔

1 انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کو ہٹایا جائے اور دونوں قوموں میں تعلقات کو مضبوط کیا جائے۔

2 اسلام کا تحفظ کیا جائے عیسائی مشنریوں اور دیگر حملوں سے۔

3 اسلامی تعلیمات کی از سر نو تشریح کی جائے اور مسلمانوں کو جدید علوم سے ہم آہنگ کیا جائے تاکہ مسلمان اسلام کے بنیادی عقائد پر قائم رہتے ہوئے نئے تقاضوں کو سمجھ سکیں۔

4 مسلمانوں کے اندر انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھنے کا شوق پیدا کیا جائے تاکہ وہ حکومت کے انتظامی کاموں میں برابر کے شریک ہو سکیں۔

سرسید کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز 1857 کے غدر کے بعد ہوتا ہے۔ بغاوت فرو ہوتے انھوں نے دو انقلابی کتابیں "تاریخ سرکشیٔ ضلع بجنور" اور "اسباب بغاوت ہند" لکھیں، جس نے اس عہد کے سیاسی منظر نامے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ تاریخ سرکشیٔ ضلع بجنور دراصل ایام غدر کا روزنامچہ ہے جو ایک سال کے عرصہ میں بجنور اور قرب وجوار کے علاقوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے علاوہ امراء ورؤسا اور انگریز حکام کے درمیان گفتگو، معاہدے یا باہمی خط وکتابت پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس "اسباب بغاوت ہند" میں وہ صرف انگریز حکام سے مخاطب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی چند کاپیاں اپنے پاس رکھ کر تقریباً پانچ سو جلدیں برٹش پارلیمنٹ کے ممبران کے لیے روانہ کر دیں۔ برٹش پارلیمنٹ میں جب یہ کتاب پڑھی گئی تو بعض ممبر آپے سے باہر ہو گئے۔ مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سکریٹری مسٹر سل بیڈن کا ردعمل یہ تھا کہ اس شخص کی تحریر سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ لہٰذا اس سے حسب ضابطہ باز پرس کی جائے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو (اسے) سخت سزا دی جائے۔ لیکن وہیں گورنر جنرل لارڈ کیننگ اور سر بارٹر فریر جیسے انصاف پسند اور ذی شعور حکام بھی تھے۔ جنھوں نے اس کتاب کے مندرجات کو خیر خواہی پر محمول کیا۔

1857 کی اس شورش کا سرسید نے نہ صرف یہ کہ مشاہدہ کیا تھا بلکہ خود بھی اس تلخ تجربے سے گزرے تھے۔ ایک طرف تو وہ بجنور میں آن ڈیوٹی اپنے فرائض انجام دے رہے تھے دوسری جانب خدمت خلق بھی انجام دے رہے تھے۔ سرسید نے جہاں بجنور میں انگریزوں کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر کی وہیں دہلی میں ان کا گھر لوٹ لیا گیا۔ جب وہ دہلی گئے تو دیکھا ان کی والدہ اور خالہ ایک کمرے میں بند ہیں۔ دونوں کو وہ میرٹھ لائے مگر والدہ کی صحت خراب ہو چکی تھی اور اسی کیفیت میں ان کا انتقال بھی اکتوبر 1857 میں ہو گیا۔ سرسید کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اس بدامنی کے دور میں رسالہ اسباب بغاوت ہند، سرکشی ضلع بجنور جیسی تصانیف تحریر کیں اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے انگریز حکومت کے قومی تعصب اور مذہبی منافرت، ظلم وستم اور عتاب کا ذکر کیا جس کا نشانہ بطور خاص مسلمان بنے تھے اور انگریزوں کو اس جانب توجہ دلائی کہ بغیر مفاہمت اور مصالحت کے دونوں قومیں ترقی یافتہ نہیں بن سکتیں۔ انھوں نے ہر ہر موقع پر مسلمانوں کو بھی راغب کیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں اور ان کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر تعلیمی ترقی کو فروغ دیں۔ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد انگریز حکومت نے اپنا رویہ بھی تبدیل کیا اور عوام کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب اور عقائد کا تحفظ کیا جائے گا ان کی قابلیت اور تعلیم کے مناسبت سے ملازمتیں دی جائیں گی اور ترقیاں ملیں گی۔ نوابوں اور راجاؤں کے ریاستی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کیا جائے گا۔ دوسری

جانب ہندوستانی عوام نے بھی تیزی سے مغربی علوم وادب اور سائنسی ترقیوں سے استفادہ کیا اور اپنے اندر مساوات، وطنیت اور قومیت کے جذبے کو بیدار کیا جس کے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوئے۔

"اسباب بغاوت ہند" میں سرسید نے بڑی بے باکی سے 1857 کے غدر کے مندرجہ ذیل پانچ اسباب متعین کیے ہیں:

(1) تجاویز حکومت سے متعلق رعایا کی غلط فہمی

(2) ہندوستانی سیاسی نظام اور یہاں کے عوام کے رسم ورواج کے بر خلاف اصول و قانون اور سیاسی نظام کا نفاذ

(3) رعایا کے رسم ورواج عادات واطوار، ان کی بدحالی اور مصائب سے حکومت کی ناواقفیت

(4) فوج میں بد نظمی، بے اطمینانی اور ہندو مسلم اتحاد اور

(5) اچھی حکومت کے لیے حاکم اور رعایا میں اچھے روابط جیسے لازمی امور کا ترک کر دینا اور قانون ساز کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شرکت۔ ان سارے اسباب پر سرسید نے تفصیلی بحث کی ہے۔

1871 میں ڈاکٹر ہنٹر کی ایک اشتعال انگیز کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" نے ایک بار پھر ہندوستان کی سیاسی فضا کو مکدر کرنے کی کوشش کی۔ علمی حلقے میں اس کتاب کے معروضات اور دلائل پر زور وشور سے بحث چھڑ گئی اور سرسید نے برسوں کی محنت سے جو امن و آشتی کا ماحول پیدا کیا تھا وہ خطرے میں پڑتا نظر آرہا تھا۔ چنانچہ سرسید نے ایک بار پھر ہندوستانی مسلمانوں کے دفاع کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی اور بڑے مدلل انداز میں ہنٹر کی کتاب کا جواب لکھ کر بڑھتے ہوئے طوفان کا رخ موڑ دیا۔

1885 میں سرسید نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر ایک بڑی قومی خدمت اس وقت انجام دی جب مسٹر ہیوم کی سرپرستی میں انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک وجود میں آئی اور ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس تحریک کی حمایت کی۔ سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے جواب میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر کے مسلم نوجوانوں کو میدان سیاست میں اترنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، اور مسلم نوجوانوں کو یہ نصیحت کی کہ "پہلے لائق بنو پھر خواہش ظاہر کرو۔"

علی گڑھ تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے سرسید نے 1886 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ کیوں کہ سرسید یہ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک کالج کافی نہیں ہے۔ اس لیے سرسید نے ایک انجمن قائم کی جو پورے ملک میں تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس کے سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے جس میں مسلم دانشور شریک ہوتے اور تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی پستی کا جائزہ لیتے اور ان کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کرتے۔ جو اقدامات اٹھائے گئے تھے ان کا تجزیہ بھی کرتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں کانفرنس کو توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور حکومت نے بھی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر توجہ دینا شروع کر دیا اور بہت سے معاملات میں ہمدردانہ رویہ اپنایا۔ اس کے اجلاس میں ہونے والی کارروائیاں شائع ہوتیں جن میں تقاریر اور خطبات کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح سیاسی، سماجی اور تعلیمی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے۔ اس کانفرنس کے ذریعے علی گڑھ تحریک کو ہمہ جہت وسعت اور کامیابی نصیب ہوئی۔

سرسید نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ سرسید کو اس بات کا ڈر تھا کہ اگر مسلمان سیاست میں حصہ لیں گے تو

تعلیمی سرگرمیاں کمزور پڑ جائیں گی۔ اور اگر مسلمان سیاست میں قدم رکھیں گے تو انھیں وہی روزِ بد دیکھنا پڑے گا جو 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ سرسید چاہتے تھے کہ پہلے مسلمان تعلیمی لحاظ سے مستحکم ہو جائیں اور خود کو اس لائق بنالیں کہ وہ انگریزوں کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔ اس لیے سرسید کو انگریزوں کا خوشہ چیں اور انڈین نیشنل کانگریس کا مخالف بتایا گیا۔ سرسید انگریزوں کے کہنے پر کرتے تھے ایسے الزام بھی لگائے گئے۔ لیکن یہ ساری باتیں بے بنیاد ہیں۔ سرسید نا تو کسی سے ڈرتے تھے اور نہ ہی اپنے ذہن پر کسی کو مسلط ہونے دیتے تھے۔ وہ کالج کے کام میں بھی حکومت کی بے جا دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔

سرسید خوددار انسان تھے۔ ان کے متعلق یہ بات کس طرح کہی جاسکتی ہے کہ وہ انگریزوں کے خوشہ چیں تھے اور کانگریس کی مخالفت ان کے ایما پر کرتے تھے۔ دراصل سیاست میں حصہ لینے کے لیے سرسید مسلمانوں کے لیے فضا ساز گار نہیں سمجھتے تھے اس لیے سیاسی تحریک سے مسلمانوں کی وابستگی کے مخالف تھے۔ تعلیمی میدان میں سرسید نے حکومت سے تعاون کی حکمت عملی کو اپنایا اور مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کیا۔

1.5 سرسید کی سماجی دردمندی

سرسید احمد خاں کا شمار انیسویں صدی کی عبقری شخصیت میں ہوتا ہے۔ یہ صدی علمی، تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی ہر اعتبار سے روبہ زوال تھی۔ یہ عہد ہر طرح کی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ اس وقت قدیم نظام دم توڑ رہا تھا اور ایک نئے جہان کی تشکیل ہو رہی تھی، جس کے سبب لوگوں میں انتہائی بے چینی اور مایوسی کا ماحول تھا۔ ایسے پُر آشوب دور میں سرسید کا جنم ہوا، جنھوں نے اپنی دوربیں آنکھوں سے اپنے عہد کا انتشار، انقلاب اور عبوری دور دیکھا۔ یہ عہد مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے استحکام کا عہد تھا۔ اس عرصہ میں ملک کا سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظام ابتر تھا۔ ہندوستانی عوام شک، وہم اور خوف میں مبتلا تھے، نتیجتاً ان کے اندر بیجا راہ ورسم، بدعت ورسومات نے گھر کر لیا تھا اور یہیں سے ان کی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زوال شروع ہوتا ہے۔ اسی عہد میں انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہو کر زمام ہند اپنے ہاتھ میں لے لی اور ان پر طرح طرح کے مصائب شروع کر دیے، جن سے نبرد آزمائی ایک الگ مسئلہ تھا۔ ایسے حالات میں ہندوستانیوں کی معاشی اور سماجی حالت مزید دگرگوں ہو گئی۔ اس کا منفی نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ہندوستانی عوام علمی وادبی اور معاشی اعتبار سے پستی وذلت میں چلی گئی، ان کا کوئی قائد اور رہنما نہ بچا لہٰذا انھوں نے اپنے اپنے طور پر مذہبی روایات میں تبدیلیاں کر لیں اور غلط راہ پر گامزن ہو گئے۔ انھوں نے اپنی لاعلمی کے سبب مذہب کی بے جا تقلید اور فرسودہ رسومات کو اصل مذہب تسلیم کر لیا اور اس طرح اخلاقی طور پر قعر مذلت میں گرتے چلے گئے۔

جب انگریزوں نے پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا تو ہندوستانیوں کے ساتھ جانوروں جیسا برتاؤ کرنے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے رسم ورواج اور مذہبی عقائد میں بھی دخل دینے لگے۔ ان کی بدحالی اور کسمپرسی کی وجہ سے ان کو مختلف طریقے سے ذلیل بھی کرنے لگے۔ پادری اور مشنریاں عیسائیت کی تبلیغ کرنے لگے۔ وہ اپنے مذہب کی خوبیوں کو بیان کرتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بزرگوں کی دل کھول کر برائی کرتے ہندوستانی عوام اس کو مجبوراً برداشت کرتے تھے۔ کیونکہ عیسائی مبلغین کو کمپنی کی حمایت حاصل تھی

یہاں تک کہ جو بچے مشنری اسکول میں داخل ہوتے تھے، ان کو عیسائی عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے باوجود لوگ اپنے بچوں کو ان کے اسکولوں میں بھیجتے تھے تاکہ نوکری مل جائے اور ذریعہ معاش کا انتظام ہو جائے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد صرف حکومت کے کاموں سے سروکار نہیں رکھا بلکہ مذہبی رسم و رواج پر بھی تنقید کی ساتھ ہی ایسے قانون بھی بنائے جن سے ہندوستانیوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ مثال کے طور پر 'ستی پر تھا' کو ختم کر دیا گیا۔ اس کو ہندوؤں نے اپنے مذہبی رسم ورواج کے خلاف سمجھا۔ اسی طرح گود لینے کے ہندو رسم ورواج میں اصلاح کی گئی۔ 1856 میں ایکٹ 15 میں ہندو بیوہ عورتوں کے حقوق فراہم کیے گئے۔ اس ایکٹ کو بھی ہندوؤں نے ناپسند کیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے اوقاف کو ضبط کرنے کا بھی قانون بنایا گیا۔

سرسید کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو انھیں شدید ملال ہوا اور انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو گمنامی اور جہالت، توہم پرستی، اوہام پرستی سے نکالنے اور باز رکھنے کے لیے تعلیم کا سہارا لیا۔ وہ مسلمانوں کو جدید مغربی علوم وفنون سے آشنا کرانا چاہتے تھے۔ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ ہندوستان کی دوسری قومیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کافی ترقی کر چکی ہیں جبکہ مسلمان ان سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ چاہتے تھے مسلمان دیگر ترقی یافتہ اقوام کی طرح جدید علوم وفنون حاصل کریں اور معاشرتی سطح پر ان سے ربط قائم کریں تبھی ترقی کے منازل طے کر سکتے ہیں، جبکہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے وہ لامذہب ہو کر عیسائی ہو جائیں گے، ان کے بچوں میں غلط افکار رائج ہوں گے اور وہ بے راہ رو ہو جائیں گے۔ حالانکہ سرسید نے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر بھی زور دیا تھا۔

سرسید یہ بھی جانتے تھے کہ ایسے پُر آشوب دور میں صرف تعلیم ہی مسلمانوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ تعلیم سے ہی ان کی علمی، ادبی اور معاشرتی زندگی پائیدار ہو سکتی ہے۔ گویا سرسید کے نزدیک انگریزی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہونا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس کے بغیر مسلمان سرکاری ملازمت، تجارت اور درس و تدریس میں ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوؤں نے انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا اور ہندو قوم میں بیداری کی ابتدا ہو چکی تھی۔

سرسید نے بھی مسلمانوں کی بھلائی کی جانب سے روگردانی نہیں کی بلکہ انتھک محنت کر کے کئی تعلیمی ادارے قائم کیے، کتابیں تصنیف کیں اور تحریکوں کا قیام کر کے ان سے اصلاح قوم کا کام لیا۔ اس سلسلہ میں سرسید نے غازی پور میں 1862 میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کیا۔ اور اسی سال اسے علی گڑھ منتقل کر دیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی بھی علی گڑھ تحریک کا ایک اہم حصہ ہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی نے انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرا کے شائع کیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے مقاصد یہ تھے کہ ان کتابوں کا ترجمہ کیا جائے جو انگریزی یا کسی اور زبان میں ہونے کی وجہ سے ہندوستانی نہیں سمجھ پاتے۔ اس کے علاوہ کمیاب اور نایاب کتابوں کو تلاش کر کے شائع کرنا اور سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ رکھنا وغیرہ اس کے اصول میں شامل تھے۔ 1862 میں نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی۔ 1866 میں دیوبند مدرسہ کی تعمیر عمل میں آئی۔ علماء ہندوستان نے قومی اتحاد کی کوششیں کیں۔ 1857 کے بعد انھوں نے بیداری کو عام کیا۔ غلط رسوم ورواج اور روایتی باتوں کی مخالفت کی۔ معاشرے کی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم کو ترقی کی بنیاد بنایا اور مذہبی شدت پسندی کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں مولانا احمد شاہ، حاجی امداداللہ، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عبدالرشید گنگوہی، مولانا فضل

حق خیر آبادی اور عبدالقادر لدھیانوی کے نام سر فہرست ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر ہندوستانی مصلحین میں رابندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر نے بلا تفریق مذہب تعلیم پر زور دیا اور ذات پات، اونچ نیچ اور طبقاتی تقسیم کو غیر ضروری تصور کیا۔

1864 میں علی گڑھ منتقلی کے بعد انھوں نے سوسائٹی کا اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ 1867 میں انھوں نے بنارس میں ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا۔ 1868 میں رسالہ احکام طعام اہل کتاب تحریر کیا جس میں اہل کتاب کے ساتھ کھانے کو مباح اور جائز بتایا گیا۔ 1869 میں لندن گئے اور وہاں کی طرز معاشرت، کتب خانوں، اداروں، تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا۔ دوران قیام "خطبات احمدیہ" لکھ کر ولیم میور کے ان اعتراضات کا مدلل جواب دیا جو انھوں نے رسالت مآبؐ کی شخصیت پر کیے تھے۔ 1870 میں واپس ہندوستان آکر ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی طرز پر مسلمانوں کی اصلاح اور بیداری کے لیے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔

اس کے بعد سرسید نے معاشرتی اصلاح کے لیے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے فیضان حاصل کیا۔ شاہ صاحب کو ہندوستان میں علم الکلام کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا۔ سرسید نے جدید علوم و فلسفہ کی رعایت رکھتے ہوئے معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔

1866 میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا جو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں دو کالم بنے ہوئے تھے، ایک طرف اردو اور دوسری طرف انگریزی عبارت ہوتی تھی۔ یہ اخبار ہفتے میں ایک بار نکلتا تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہفتے میں دوبار نکلنے لگا۔ اس میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔

سرسید نے معاشرتی اصلاح کے لیے 1870 میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس مرحلے میں انھوں نے انگریزی صحافی اسٹیل اور ایڈیسن کی قائم کی ہوئی روایات کی پیروی کی۔ انھوں نے لندن میں ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر اخبار کے ذریعے اصلاح معاشرت کا کام کیا تھا۔ سرسید نے بھی تہذیب الاخلاق سے یہی کام کیا۔ لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن اس کے باوجود عوام میں اس نے مقبولیت حاصل کرلی اور مسلم معاشرے میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

ہندوستانی قوم کی سماجی حالت میں اصلاح کے لیے سرسید اپنے قیام انگلستان کے دوران کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں کے طریقہ تعلیم کا بغور مشاہدہ کیا اور اپنے ذہن میں یونیورسٹی تعلیمی نظام کا خاکہ مرتب کیا۔ واپس آکر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طرز پر ادارہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے ان کی سخت مخالفت بھی ہوئی لیکن سرسید پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مقصد میں منہمک ہو کر آگے بڑھتے گئے اور 1875 میں تعلیمی مشن کو فروغ دینے کے لیے مدرسۃ العلوم کا سنگ بنیاد رکھا اور 1876 میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر خود کو کالج کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

1877 میں مدرسۃ العلوم کے نام میں تبدیلی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا گیا۔ اور اس کا سنگ بنیاد وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں رکھا گیا۔ شروع میں اس میں دو شعبے قائم کیے گئے، ایک شعبہ انگریزی اور دوسرا شعبہ علوم مشرقیہ جس میں عربی، فارسی کے ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا تھا لیکن غیر مسلم طلبا کے لیے اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ ہندو مسلم کی تفریق کبھی نہیں کی گئی۔ غیر مسلم طلبا کو ہمیشہ مسلم طلبہ کے برابر حقوق حاصل رہے۔

سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھوں کی طرح سمجھتے تھے۔

1886 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ قائم کی جس کا مقصد ملک کے دیگر حصوں میں تعلیمی صورتحال سے واقف ہونا اور اس سلسلے میں تعلیمی سرگرمیوں کو مزید فعال بنانا تھا۔ سیاست سے مسلمانوں کو دور رکھنے اور تعلیمی سطح پر مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے انھوں نے 1888 میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن تشکیل دی۔ بغور مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان کے عہد میں ہندوستانیوں کی سماجی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے جتنا کام دانشوروں اور مصلحوں نے مل کر کیا تھا سرسید نے مسلم قوم کے لیے تن تنہا کر دیا۔ ظاہر ہے ان کے سامنے ان کے عہد میں ان مصلحین و مفکرین کی سرگرمیاں موجود تھیں اور انھوں نے ان تمام کا براہ راست یا بالواسطہ دونوں سطحوں پر اثر بھی قبول کیا تھا۔

1.6 سرسید کے معاصر فکری رویے اور اصلاحی تحریکات

غدر اور اس کے بعد کی سیاسی اور سماجی حالت کو دیکھ کر انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی ہندوؤں کے بعض اہل علم حضرات نے تعلیم کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے راجا رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر اور مدن موہن مالویہ وغیرہ جیسے مفکرین و مصلحین کی کوششوں سے ہندوؤں میں نئی تعلیمی بیداری کی لہر دوڑ گئی اور ان میں تعلیم خاص کر انگریزی تعلیم اور علوم وفنون حاصل کرنے کا چلن عام ہو گیا جس کے سبب ملازمت، تجارت غرض کہ تمام شعبوں میں ہندو، مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے لیکن مسلمان انگریزی سے بے بہرہ رہے کیوں کہ انگریزوں نے اقتدار انھیں سے حاصل کیا تھا اسی لیے وہ انگریز اور انگریزی تعلیم وتربیت کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے جس کے نتیجے میں مسلمان اور بھی زیادہ پچھڑ گئے۔ اسی عہد میں دھرلو نائیڈو نے 1864 میں "مدراس وید سماج" کی بنیاد قائم کی تو مہادیو گووند راناڈے نے "بمبئی پرارتھنا سماج" 1866 میں تشکیل دی۔ برہمو سماج کی تبلیغ کا کام تامل، تیلگو اور مراٹھی میں ترجموں سے کیا گیا تو 1875 میں سوامی دویکانند نے آریہ سماج کا کام شروع کیا۔ انھوں نے دیسی صنعتوں اور دستکاریوں کو فروغ دینے کے لیے اسکول قائم کیے۔ رام کرشن پرم ہنس نے مذہبی اصلاح کے کام کیے، سریندر ناتھ بنرجی نے انڈین ایسوسی ایشن کی کلکتہ میں بنیاد رکھی اور 1877 میں راناڈے نے انڈین نیشنل سوشل کانفرنس وہیں قائم کی اور 1885 میں ہیوم کے ذریعہ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام کلکتہ میں ہوا۔ سوامی رام کرشن پرم ہند کی وفات کے بعد ان کے کاموں کو فروغ دینے کے لیے 1886 میں رام کرشن مشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کے تحت مغربی فلسفہ اور جدید علوم وخیالات وافکار کو مروج کرنے کا کام تیزی سے عمل میں آیا نیز تعلیم نسواں کو بطور خاص اہمیت دی جانے لگی۔

سرسید نے لاکھ مخالفتوں کے باوجود شکست نہیں تسلیم کی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ ہونے کی ترغیب دیتے رہے۔ انھوں نے معاشرتی نقائص کا غور وخوض کے ساتھ مطالعہ ومشاہدہ کیا اور صدق دل اور قوت عمل کے ساتھ اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی کمزوریوں کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ اس وقت اپنے ملک و قوم کی ترقی وترویج کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنا ہی سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس بے بسی ولاچاری اور ادبار کے گڑھے سے باہر نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ لہٰذا اسی راستے پر

سر سید نے تمام مسلمانوں کو گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ سر سید نے بھی بہت سی تحریکوں کی بناڈالی اور اس کے ذریعہ اصلاح امت کا کام لیا۔ ان کی سب سے زیادہ متحرک اور فعال تحریکوں میں علی گڑھ یا سر سید تحریک ہے، جو مختلف جہات اور گوناگوں ابعاد کی حامل ہے۔

سر سید نے مسلم قوم کی اصلاح اور فلاح و بہبود کی کوششوں میں تاعمر مصروف رہے اورانہیں سیاسی، سماجی اور تعلیمی بحران سے بچانے کی سعی کرتے رہے۔ سر سید نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری، علوم جدیدہ اور سائنس کو فروغ دینے، انگریزی علوم و افکار کو مروج کرنے اور حکومت و عوام میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کئی کوششیں اور عملی اقدام کیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے ہیں جس کا بنیادی مقصد غیر ملکی زبان کی علمی و ادبی کتابوں کا ترجمہ تھا، اس کے علاوہ انھوں نے ایک مدرسہ بھی وہاں قائم کیا جس میں مختلف زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد سر سید نے قوم کے زوال اور پستی کا راز تلاش کیا اور اپنے خیالات و نظریات کی روشنی میں قوم کو پستی سے نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ وہ جدید اور سائنسی علوم سے قوم کو روشناس کرانے میں مصروف ہوگئے۔ اس کے لیے سر سید نے سب سے پہلے غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کے بعد ایم۔ اے۔ او۔ کالج قائم کیا۔ سر سید کا خیال تھا کہ جدید تعلیم کے بغیر قوم کی ترقی ممکن نہیں۔ قوم کی ترقی کے لیے سر سید نے جو کوششیں کیں ان سے قوم کی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہوا اور سر سید کی کاوش تحریک کی شکل اختیار کر گئی اور آہستہ آہستہ اس عہد کے دانشور ادیب و شاعر اس تحریک سے وابستہ ہوگئے جن میں حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سر سید کی عبقری، دور بیں اور ہشت پہلو شخصیت نے جدید ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں ہندو، مسلم اور عیسائیوں کو متحد کر کے ملک کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھانے کی کوششیں کیں۔ انھوں نے مناسب وقت پر جغرافیائی قومیت کی پُرزور وکالت کر کے ہندو مسلم اتحاد کے آئندہ امکانات کو مضبوط تر کر دیا۔ انھوں نے اپنے کردار و عمل سے سیکولرزم کی خوبصورت مثالیں پیش کیں۔ وہ علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی علوم میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دور بیں سیاست داں بھی تھے۔ انھوں نے وقت کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے جو بھی سیاسی اقدامات کیے، ان میں ان کا خلوص، ایمانداری اور دردمندی شامل تھی۔ انھوں نے ہندوستانی سیاست کو ایک ایسی ڈگر عطا کی جو صدیوں تک پائیدار رہے گی۔ ملکی سیاست کو درپیش مسائل میں آج بھی سر سید کے افکار و اعمال کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

1.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- سر سید احمد خاں ایک ایسے عہد میں آنکھیں کھولیں جو انتشار، انقلاب اور عبوری دور تھا۔ یہ عہد مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے استحکام کا عہد تھا۔ اس درمیان ملک کا سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظام ناگفتہ بہ تھا۔ ہندوستانی عوام تشکیک، وہم اور خوف کے سایے میں زندگی گزار رہی تھی، نتیجتاً اس کے اندر بیجا راہ و رسم، بدعت و رسومات نے گھر کر لیا تھا اور یہی ان کی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زوال کا پیش خیمہ تھا۔

- سرسید' انیسویں صدی کے برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے عظیم علمبردار کے طور پر ابھرے۔ انھوں نے ہندوستانی سیاسی حکمت عملی کی بناڈالی اور اس کے لیے لائحہ عمل طے کیا۔
- سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے جواب میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر کے مسلم نوجوانوں کو میدان سیاست میں اترنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا، اور مسلم نوجوانوں کو یہ نصیحت کی کہ "پہلے لائق بنو پھر خواہش ظاہر کرو۔"
- سرسید خوددار انسان تھے۔ ان کے متعلق یہ بات کس طرح کہی جاسکتی ہے کہ وہ انگریزوں کے خوشہ چیں تھے اور کانگریس کی مخالفت ان کے ایما پر کرتے تھے۔ دراصل سیاست میں حصہ لینے کے لیے سرسید مسلمانوں کے لیے فضا سازگار نہیں سمجھتے تھے اس لیے سیاسی تحریک سے مسلمانوں کی وابستگی کے مخالف تھے۔
- ہندوستانیوں نے اپنی لاعلمی کے سبب مذہب کی بے جا تقلید اور فرسودہ رسومات کو اصل مذہب تسلیم کرلیا اور اس طرح اخلاقی طور پر قعرِ مذلت میں گرتے چلے گئے۔
- سرسید یہ بھی جانتے تھے کہ ایسے پُر آشوب دور میں صرف تعلیم ہی مسلمانوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ تعلیم سے یہی ان کی علمی، ادبی اور معاشرتی زندگی پائیدار ہوسکتی ہے۔ گویا سرسید کے نزدیک انگریزی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہونا ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس کے بغیر مسلمان سرکاری ملازمت، تجارت اور دروتدریس میں ترقی نہیں کرسکتے تھے۔ ہندوؤں نے انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا اور ہندو قوم میں بیداری کی ابتدا ہوچکی تھی۔
- سرسید نے معاشرتی اصلاح کے لیے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے فیضان حاصل کیا۔ شاہ صاحب کو ہندوستان میں علم الکلام کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا۔ سرسید نے جدید علوم و فلسفہ کی رعایت رکھتے ہوئے معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔

1.8 کلیدی الفاظ

لفظ	:	معنی
انتشار	:	نظم و نسق کو ناکام بنانا، ہنگامہ کرنا، تخریب کرنا، خیالات کی پراگندگی، پریشان خیالی
عبوری دور	:	الجھنوں، آزمائشوں اور تجربوں کا زمانہ، بیچ کا زمانہ
استحکام	:	پختگی، مضبوطی، استواری، مضبوطی، بحالی
پیش خیمہ	:	پہلے پیش آنے والی حالت یا صورت، وہ سامان جو کوچ سے پہلے بھیجا جائے
رخنہ	:	خلل ڈالنا، روڑا اٹکانا، فتنہ و فساد برپا کرنا
قابض	:	قبضہ کرنے والا، روکنے والا، پکڑنے والا
نشاۃ ثانیہ	:	حیاتِ نو، یورپ کا وہ دور (14 ویں تا 16 ویں صدی عیسوی) جس میں علوم و فنون و ادب کو فروغ ملا

سامراجی	:	سامراج سے متعلق، شاہی
خلفشار	:	کشمکش، الجھن، پیچ و تاب، ہلچل، افراتفری، بدنظمی
اوقاف	:	وقف کی جمع، وہ جائدادیں جو قانون شرع یا حکومت کے مطابق کسی کار خیر یا اولاد کے لیے وقف یا مختص کر کے اس کے تمام حقوق سلب کر لیے جائیں
نظم و نسق	:	نظم اور ترتیب، انتظام و انصرام، سرکاری یا دفتری امور کا بندوبست
عقلیت	:	عقل سے متعلق، وہ بات جو صرف عقل میں آئے ذہن میں نہ آئے
استدلالیت	:	وہ بات جو دلیل سے ثابت کی جائے، وہ ذہنی عمل جو دلائل کی روشنی میں مقدمات سے نتائج اخذ کرے
اضطراب	:	بے چینی، بے قراری، تشویش، رنج و ملال
حکمت عملی	:	تدبیر، مصلحت، پالیسی، ملکی تدبیر
مقفیٰ و مسجع	:	ایسا بیان جس میں ہم قافیہ اور ہم آہنگ الفاظ استعمال کیے جائیں۔
خوشہ چیں	:	اکٹھا کرنے والا، جمع کرنے والا
عقد ثانی	:	دوسرا نکاح
منسوخ	:	مسترد، رد کیا ہوا، متروک، باطل
نالاں	:	روتا ہوا، فریاد کرتا ہوا
ناگفتہ بہ	:	وہ بات جس کو بتانا دشوار ہو، وہ بات جو نہایت خراب ہو
تلاطم	:	شدت سے موجوں کا اٹھنا اور آپس میں ٹکرانا، پانی کے تھپیڑے، طوفان
معاصر	:	اپنے زمانے کا، ہم عصر، ہم عہد
احیا	:	جان ڈالنا، زندہ کرنا
مصلحین	:	مصلح کی جمع، اصلاح کرنے والا، برائیاں دور کرنے والا
ہشت پہل	:	آٹھ پہلوؤں والا
وسیع النظری	:	بلند خیالی

1.9 نمونہ امتحانی سوالات

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ غدر کا واقعہ کس سن میں ہوا؟

1857(a) 1957(b) 1856(c) 1858(d)

2۔ سرسید کی پیدائش کس صدی میں ہوئی؟

(a) انیسویں (b) سترہویں (c) اٹھارہویں (d) ان میں سے کوئی نہیں

3۔ مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار کون تھا؟

(a) اورنگ زیب (b) بہادر شاہ ظفر (c) عماد الملک (d) برہان الملک

4۔ اسباب بغاوت ہند میں سرسید نے غدر کی کتنی وجوہات بیان کی ہیں؟

(a) چھ (b) چار (c) پانچ (d) تین

5۔ مدرسۃ العلوم کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا؟

1875(a) 1876(b) 1877(c) 1874(d)

6۔ آریہ سماج کے بانی کون تھے؟

(a) راجہ رام موہن رائے (b) سرسید احمد خاں (c) سوامی دیانند سرسوتی (d) ان میں سے کوئی نہیں

7۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام کہاں عمل میں آیا؟

(a) علی گڑھ (b) مرادآباد (c) دہلی (d) غازی پور

8۔ انیسویں صدی کے برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے عظیم علمبردار کے طور پر کس کو یاد کیا جاتا ہے؟

(a) راجہ رام موہن رائے (b) سرسید احمد خاں (c) علامہ شبلی نعمانی (d) شاہ ولی اللہ

9۔ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے کہاں مقید کیا تھا؟

(a) کلکتہ (b) دہلی (c) رنگون (d) حیدرآباد

10۔ غدر کے فوراًبعد سرسید نے کون سی کتابیں تصنیف کیں؟

(a) تحریر فی اصول التفسیر-طریقۃ الصلوٰۃ (b) قدیم نظام دیہی-رسالہ ہو الموجود

(c) تفسیر جن الجان-رسالہ ابطال غلامی (d) تاریخ سرکشیئ ضلع بجنور اور اسباب بغاوت ہند

1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ سرسید سے قبل کے سیاسی حالات کیسے تھے؟

2۔ سرسید سے قبل مسلمانوں کی سماجی حالت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیوں کر ہوا؟

4۔ سرسید نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اس عہد کے حالات کیسے تھے؟

5۔ سرسید نے مسلمانوں کی معاشرتی حالت کو سدھارنے کے لیے کیا اصلاحیں کیں؟

1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ عہدِ سرسید کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔

2۔ "اسباب بغاوت ہند" کیوں اور کب لکھی گئی؟

3۔ سرسید کی معاصر تحریکوں کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے؟

1.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	سرسید اور ان کا عہد	ثریا حسین
2۔	سرسید اور علی گڑھ	پروفیسر خلیق احمد نظامی
3۔	سرسید کے معاصر فکری رویے	پروفیسر عبدالحق
4۔	برصغیر کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید تحریک کا مقام	پروفیسر اصغر عباس
5۔	سرسید احمد خان کی سوانح حیات، سید معین الحق	مشمولہ فکر و نظر

1.9.1 کے جوابات: a۔1 a۔2 b۔3 c۔4 a۔5

c۔6 d۔7 b۔8 c۔9 d۔10

اکائی2 : سر سید احمد خاں کے حالات زندگی

اکائی کے اجزا

2.0		تمہید
2.1		مقاصد
2.2		سوانحی حالات
2.3		تعلیم وتربیت
2.4		ملازمت اور سفر انگلستان
	2.4.1	سر سید کا اسفر انگلستان
2.5		تصانیف اور اداروں کا قیام
	2.5.1	سائنٹفک سوسائٹی
	2.5.2	مدرسۃ العلوم
	2.5.3	محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس
2.6		سر سید اور 1857ء
2.7		شخصیت اور قومی خدمات
2.8		اکتسابی نتائج
2.9		کلیدی الفاظ
2.10		نمونہ امتحانی سوالات
	2.10.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	2.10.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	2.10.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
2.11		تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

انیسویں صدی میں ہندوستان برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نو آبادیاتی شکنجے کی گرفت میں تھا اور شدید استحصال کا شکار تھا۔ اس سیاسی تسلط کے برے اثرات ہندوستان کی معاشیات کے علاوہ معاشرت و ثقافت پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ اس صورتحال کے پیش نظر ہندوستان کے مختلف سماجی اور مذہبی طبقات میں متعدد اصلاحی تحریکیں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے سماج میں مثبت تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ اس عہد میں مسلم سماج ملک کے دیگر مذہبی معاشروں کے مقابلے، سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے زیادہ پسماندگی کا شکار تھا۔ مسلم حکمرانوں نے کئی صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی تھی جو زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ سیاسی طور پر تباہ ہو جانے کے بعد مسلم طبقے میں معاشی اور معاشرتی کمزوریاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ صورتحال 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد بد سے بدتر ہوتی چلی گئی کیونکہ مسلم طبقہ حکومت سے وابستگی کے سبب ہندوستان پر قابض ہونے والے انگریز حکمرانوں کے شکوک اور نفرت کا شکار بنا۔ ایسے پر آشوب دور میں ہندوستانی مسلم سماج کو ان کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے اور انھیں دیگر ترقی پذیر ہندوستانی طبقات کی طرح اپنے لیے بہتر مستقبل کی تعمیر میں متحرک ہونے پر آمادہ کرنے اور قوم کو بیدار کرنے کا کام سرسید احمد خاں نے کیا۔ وہ انیسویں صدی میں مسلم سماج کے سب سے اہم سماجی رہنما اور مصلح تھے جن کی کوششیں ایک تحریک کی شکل میں سامنے آئیں۔ جسے ہم 'سرسید تحریک' یا 'علی گڑھ تحریک' کے نام سے جانتے ہیں۔ اس تحریک نے ہندوستانی سماج پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس اکائی میں ہم سرسید احمد خاں کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- سرسید احمد خاں کی پیدائش اور خاندانی حالات بیان کر سکیں۔
- سرسید احمد خاں کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم پر روشنی ڈال سکیں۔
- سرسید احمد خاں کی مختلف ملازمتوں کا حال بیان کر سکیں۔
- سرسید احمد خاں کی تصانیف اور ان کے قائم کردہ اداروں سے واقف ہو سکیں۔
- 1857ء کی شورش میں سرسید احمد خاں کے تاریخی کردار کا تذکرہ کر سکیں۔
- سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کی قومی خدمات پر اظہار خیال کر سکیں۔

2.2 سوانحی حالات

ولادت اور خاندانی کوائف:

سرسید کا اصل نام سید احمد خاں تھا۔ ''سر'' ان کا خطاب تھا جو انگریز حکومت نے ان کی شاندار خدمات کے صلے میں عطا کیا تھا۔ سید احمد خاں

کی پیدائش 17 اکتوبر 1817ء کو دلی میں ہوئی۔ بقول حالی ان کے سلسلہ نسب میں سب سے آخری امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہما السلام ہیں اور اسی لیے وہ خود کو تقوی سید کہتے تھے۔ سرسید کے اجداد نے عرب سے ترک وطن کر کے ایران کے شہر ہرات میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ایک طویل عرصے کے بعد سرسید کے بزرگ شاہجہاں کے دور حکومت میں ہندوستان آئے اور مغل دربار سے وابستہ ہو گئے۔ شاہجہاں سے اکبر شاہ ثانی کے دور حکومت تک سرسید کے آباواجداد مغل دربار سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے۔ سرسید کے دادا اور ان کے بھائی کو عالمگیر ثانی نے خطاب اور منصب سے نوازا تھا۔ سرسید کے والد میر متقی کے بھی مغل فرماں روا اکبر شاہ سے گہرے روابط استوار تھے۔ پشتینی خدمات کے سبب شاہی دربار میں ان کا دخل بہت زیادہ تھا۔ بادشاہ کی خوابگاہ تک ان کی رسائی تھی۔ قلعے سے ان کی تنخواہ مقرر تھی۔ سرسید کے ننھیال کے بزرگ بھی علم و فضل میں شہرت کے حامل تھے۔ سرسید نے اپنی تصنیف 'سیرت فریدیہ' میں اپنے نانا خواجہ فرید کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ سرسید کے نانا ریاضیات میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ ریاضی کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ لکھنؤ کے فرنگی حکام کی سفارش پر وہ انگریزوں کے قائم کردہ کلکتہ کے مدرسہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کلکتہ میں انھوں نے انگریز حکام میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ 1803ء میں انگریز گورنر جنرل ویلزلی کے حکم پر انھیں بطور سفیر ایران بھیجا گیا۔ سرسید کے والد کی سفارش پر 1815ء اکبر شاہ ثانی نے انھیں کلکتہ سے بلا کر دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کے خطابات سے نوازا اور اپنا وزیر مقرر کیا۔

دربار کے سازشی ماحول سے گھبرا کر خواجہ فرید وزارت چھوڑ کر واپس کلکتہ چلے گئے۔ سرسید کے والد سید محمد متقی نے اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر بادشاہ سے پھر سفارش کی اور ان کی سفارش پر اکبر شاہ ثانی نے 1819ء میں خواجہ فرید الدین کو دوبارہ کلکتہ سے بلا کر اپنا وزیر بنایا۔ ایک مدت تک وہ وزارت کے عہدے پر رہے لیکن اپنے انگریز دوست جنرل (ریذیڈنٹ) کے مشورے پر استعفیٰ دے دیا اور بقیہ زندگی دہلی میں گزاری۔ انھوں نے وزیر فرخ سیر کی عالیشان حویلی خریدی جس کے احاطے میں ان کی بڑی صاحبزادی عزیز النسا بیگم جو سرسید کی والدہ تھیں، اور سرسید کی چھوٹی خالہ دونوں نے اپنے لیے عمدہ حویلیاں تعمیر کروائیں اور اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہوئیں۔ خواجہ فرید الدین کی منجھلی بیٹی کی شادی دہلی کچہری کے صدر امین سے ہوئی جن سے سرسید نے 1838ء میں عدالتی کام سیکھا۔

سرسید کے والد:

سرسید کے والد کا نام سید محمد متقی تھا۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کی طرح ہی مغل دربار سے وابستہ تھے جب کہ مغل حکومت برائے نام ہی باقی رہ گئی تھی۔ محمد متقی کا گھرانہ دیگر مسلم رئیسوں کی طرح قدامت پسند اور جاگیر دارانہ تھا۔ سرسید ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ سرسید اپنے والد کے ساتھ اکثر دربار خاص جایا کرتے تھے۔ سرسید نے تیراکی اور تیر اندازی اپنے والد سے سیکھی۔ بقول حالی میر متقی نہایت آزاد منش آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے گزاری۔ وضعدار اور سچے شخص تھے۔ وہ دلی کی مشہور خانقاہ کے صوفی بزرگ حضرت شاہ غلام علی کے مرید تھے۔

سرسید کی والدہ:

سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم نے سرسید کی تربیت اور ان کے اخلاق و عادات سنوارنے پر نہایت توجہ دی۔ وہ ایک قابل خاتون

تھیں اور قران مجید کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بڑی تندہی سے کی۔ حالی کے مطابق سرسید کی تربیت اور تمام واقعات زندگی میں ان کی والدہ کا بڑا دخل رہا ہے۔ چونکہ سرسید کے والد آزاد اور بے فکر آدمی تھے اور مرید بننے کے بعد اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے لاتعلق ہو گئے تھے، اس لیے سرسید کی تعلیم و تربیت کا فرض ان کی والدہ پر عائد ہوا جسے انھوں نے نہایت احسن طریقے سے ادا کیا۔ سرسید نے والدہ کی تربیت کے بارے میں کئی واقعات لکھے ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں سرسید نے کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے گھر کے قدیم اور بوڑھے نوکر کو تھپڑ مار دیا۔ ماں نے سرسید کو گھر سے نکال باہر کیا۔ یہ خالہ کے گھر کی ایک کوٹھری میں جا کر چھپ گئے۔ تین دنوں کے بعد خالہ نے انھیں ان کی ماں کے پاس لے جا کر سفارش کی۔ ماں نے معافی کی یہ شرط رکھی کہ سرسید نوکر سے معافی مانگیں، اگر اس نے معاف کر دیا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ سرسید نے نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب کہیں ماں نے اُنہیں معاف کیا۔ سرسید نے اپنی والدہ کے صبر وضبط کے متعلق بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ سرسید کے بیان کے مطابق ان کے بڑے بھائی کی سنگین بیماری کی وجہ سے ان کی والدہ ایک مہینے سے رات بھر جاگ کر ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایسی ہی کسی رات بڑے بھائی کی موت رات کے اخیر پہر ہو گئی۔ ان کی والدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ فجر کی اذان ہوئی تو ان کی والدہ نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ اشراق کی نماز تک مصلے پر بیٹھی رہیں۔ ان کی کسی رشتہ دار کی بیٹی کی شادی چار دنوں بعد تھی۔ اس شادی کو رشتہ داروں نے خاندان کی اس موت کے سبب موقوف کرنا چاہا۔ سرسید کی والدہ بیٹے کی موت کے تین دن بعد اس رشتہ دار کے گھر گئیں اور اصرار کر کے شادی کو ملتوی کرنے سے روکا۔ وہ بیواؤں کے عقد ثانی کی پرزور حمایت اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ عقد ثانی کرنے والوں کے گھر جا کر ان کی خبر گیری کرتیں اور عقد ثانی کی مخالفت کرنے والوں کو ناپسند کرتی تھیں۔

سرسید کی والدہ گھر میں ہونے والی آمدنی میں سے پانچ فی صد حصہ ان پردہ نشیں خواتین کی مدد پر خرچ کرتیں جو معاشی تنگی کا شکار تھیں۔ ایک مرتبہ اپنی بیماری کے علاج کے لیے بڑے حکیم کے تجویز کردہ نسخے سے تیار کردہ قیمتی معجون ایک غریب لاوارث بڑھیا کو دے دیا کیونکہ وہ بھی اسی مرض میں مبتلا تھی جب کہ سرسید کی والدہ کو خدا نے بغیر معجون کے شفا دے دی۔ خدا کا کرنا کہ غدر میں اسی لاوارث بڑھیا کی کوٹھڑی میں سرسید کی ماں اور خالہ نے جان بچا کر پناہ لی۔ انہوں نے اپنے تمام زیورات خیرات کر دیے تھے۔ ان کی دانشمندی کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے لکھا ہے کہ نانا کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سفر کے خرچ کے ساتھ اپنا خاص آدمی بھیج کر بلایا لیکن سرسید کی والدہ نے اپنے والد کو اس سے باز رکھا کیونکہ اسے قبول کرنے سے انگریزی عملداری میں رہنا پڑتا۔

سرسید کی والدہ بے جا رسوم ورواج کے خلاف تھیں۔ سرسید کے ساتھ کسی شخص نے برائی اور دشمنی کی تھی۔ جب سرسید اس لائق ہوئے کہ اس سے انتقام لے سکیں تو ان کی والدہ نے انھیں سمجھایا کہ یا تو اسے معاف کر دو یا پھر خدا پر چھوڑ دو کہ وہ تمہارے بدلے اسے سزا دے۔ سرسید تسلیم کرتے ہیں کہ والدہ کی اس خاص تربیت کا ایسا اثر ہوا کہ پھر عمر بھر کسی سے بدلہ لینے کا خیال ذہن میں نہیں آیا۔ سرسید سے ناراضگی کی وجہ سے ایک حکیم صاحب، جنہیں وہ اپنا بڑا بھائی مانتے تھے، نے ملنا چھوڑ دیا تو سرسید نے بھی ان کے پاس جانا چھوڑ دیا تب والدہ نے سرسید کو نصیحت کی کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات خود کرتے ہو۔ اگر وہ تم سے نہیں ملتے تو کوئی بات نہیں، تم ہمیشہ ان سے ملتے رہو۔ اس طرح سرسید کی والدہ نے ان کی تربیت کی کہ وہ دوسروں سے تعلقات کس طرح رکھیں اور نبھائیں۔

سرسید کے گھر اور ان کے ننھیال کے درمیان محض ایک سڑک کا فاصلہ تھا۔ سرسید کی والدہ نے اپنی چھوٹی بہن کو جو نابینا ہو گئی تھیں، اپنے ساتھ رکھا۔ ان کی بیٹی سے سرسید کی شادی کروائی۔ 1857ء میں جب انگریزی افواج نے ان کے گھر پر حملہ کر کے لوٹا تب وہ اپنی نابینا چھوٹی بہن کے ساتھ پڑوس کی ایک کوٹھری میں چھپ کر جان بچائی۔

بچپن اور ایام شباب:

سرسید کی پیدائش پر خوشی منائی گئی کیونکہ گھر میں چھ سال سال بعد کوئی بچہ پیدا ہوا تھا۔ خاندان کے دوسرے بچوں کی بہ نسبت سرسید جسمانی اعتبار سے تندرست اور توانا تھے۔ ان کے نانا کی نظر میں وہ جاٹ بچہ تھے۔ اُن پر اشراف کے مہذب بچوں کے علاوہ عام بچوں سے ملنے جلنے اور کھیلنے پر سخت پابندی تھی۔ حویلی سے باہر تنہا جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی حویلی اور نانا کی حویلی کے درمیان صرف ایک سڑک پار کرنے بھر کی دوری تھی لیکن وہاں بھی کسی کے ہمراہ جاتے۔ وہ جاٹوں کے گاؤں مغلپور میں والد کی زمینوں پر جاتے ہفتے بھر رہتے، جنگل میں گھومتے، پالتو گایوں بھینسوں کے دودھ، دہی، گھی کے ساتھ جاٹ عورتوں کے ہاتھوں پکی باجرے اور مکئی کی روٹیاں کھاتے تھے۔

سرسید کا بچپن والدہ اور خاندان کے بزرگوں کی نگرانی میں گزرا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر بادشاہ کے دربار جایا کرتے تھے۔ کبھی تنہا بھی دربار خاص چلے جاتے تھے۔ آٹھ نو سال کی عمر کا واقعہ ہے کہ تنہا دربار خاص دیر سے پہنچے، دربار ختم ہو چکا تھا، پھر بھی بادشاہ رک گئے، سرسید سے نہایت شفقت سے ملے اور ان سے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو بغیر کسی خوف کے کہہ دیا کہ سو رہا تھا۔ بادشاہ نے پیار سے صبح اٹھنے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے انھیں جواہرات پہنائے۔ حالی نقل کرتے ہیں کہ انھیں دنوں میں برھمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلوایا تاکہ ان کو ملنے والی شاہی پنشن میں اضافہ کی کارروائی کے لیے انھیں لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے 1831 میں لندن بھیجے گئے۔ لندن جانے سے قبل سرسید نے انھیں کئی مرتبہ دربار میں دیکھا تھا۔

سرسید کے ایام شباب رئیس طبقے کے نوجوانوں کی طرح ہی گذرے۔ حالی کے مطابق سرسید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دلوں اور رنگین صحبتوں میں گذرا تھا۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ دوستوں کے ہمراہ باغوں کی سیر کو جاتے، دعوتوں میں شریک ہوتے اور ہولی کی بھیڑ اور تماشوں کا حصہ بنتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو درگاہوں اور نانا کی قبر پر لگتے تھے اس میں جوش و خروش سے حصہ لیتے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ منتظم اور مہتمم ہوتے تھے۔ سرسید مسلم قوم کی غفلت کے ساتھ اپنے ان ایام غفلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے، ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار۔ حالی نے سرسید کی غفلت کے ایام کا ذکر اس خوبی سے کیا ہے کہ سرسید ایک ایسے انسان کے طور پر سامنے آتے ہیں جس میں انسانی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ متعدد خوبیاں موجود تھیں۔ سرسید کو اپنے بڑے بھائی سے نہایت اُنس تھا۔ بھائی کی موت کے بعد غفلت کی زندگی ترک کر کے ایسے زاہد خشک بن گئے کہ مولوی یا صوفی بھی رشک کریں۔

شادی اور اولاد:

1836ء میں سرسید کی شادی، ان کی خالہ زاد بہن پارسا بیگم سے ہوئی۔ یہ ان کی سب سے چھوٹی خالہ کی بیٹی تھیں جن کا مکان، سرسید

کے مکان سے متصل تھا۔ 1861ء میں سرسید کی بیوی کا انتقال ہو گیا جب وہ مرادآباد میں تھے۔ دو بیٹوں سید حامد اور سید محمود اور ایک کم عمر بیٹی کی سرسید نے ہی پرورش کی۔ بیٹی کا دس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت سرسید اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ انگلستان میں تھے۔ سید حامد سرسید کے لائق اور نیک فرزند تھے۔ 1894ء میں ان کا دلی میں انتقال ہو گیا۔ سرسید نے شدت غم سے دلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی۔

وفات:

سرسید وضع دار انسان تھے جس کا فائدہ اٹھا کر ان کے کالج کے ملازم شیام بہاری لال نے سرسید کا اعتماد حاصل کیا لاکھوں روپیوں کا جو آج کے کروڑوں ہوتے ہیں، غبن کر لیا۔ اس غبن کی ذمہ داری بظاہر سرسید پر آئی۔ سرسید کو ایسا جھٹکا لگا کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے۔ ضعف اور بیماری نے انہیں آن لیا۔ بالآخر اسی بیماری میں 26 مارچ 1898ء کو سرسید کا انتقال ہو گیا۔

2.3 تعلیم و تربیت

سرسید کی ابتدائی تعلیم ان کے والد محمد متقی کے مزاج کے مطابق روایتی طریقے پر ہوئی۔ مسلم رئیسوں کے یہاں بسم اللہ خوانی کی رسم دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔ سرسید کی بھی اللہ خوانی کی رسم بھی ادا کی گئی۔ مکتب کے بجائے گھر پر ہی ایک اشراف گھرانے کی پردہ نشیں خاتون نے انھیں قران پڑھایا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے مکتب جانا شروع کیا۔

سرسید کے ناناخواجہ فرید کے ایک ملازم مولوی حمید الدین سے ابتدئی روایتی کتب مثلاً خالق باری، آمد نامہ، کریما وغیرہ کا درس لیا۔ عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی استاد رکھے گئے تھے۔ ریاضی کی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی۔ ایک خاندانی حکیم سے طب پڑھی اور مطب میں پریکٹس بھی کی۔ کتابوں کے مطالعے اور غالب، صہبائی، آزردہ جیسے باکمالوں کی صحبت کی بدولت علمی شغل سے خاص شغف پیدا ہوا۔ سرسید نے اپنی شادی سے قبل جب ان کی عمر انیس سال کی تھی، باقاعدہ تعلیم کے حصول کا سلسلہ ختم کر دیا۔ جب فتح پور سیکری سے تبادلہ ہو کر منصفی کے عہدے پر دلی آئے تب مزید تحصیل علم کا سلسلہ شروع ہوا۔ غازی پور میں سالم نام کے یہودی کو نوکر رکھ کر عبرانی پڑھی تاکہ بائبل کی تفسیر لکھ سکیں۔ سرسید نے مختلف علوم کے ماہرین سے استفادہ کیا لیکن باضابطہ کسی استاد سے تعلیم حاصل نہیں کی۔

2.4 ملازمت اور سفر انگلستان

والد کی موت کے بعد سرسید نے اپنے ددھیال کے افراد اور بزرگوں کے بر خلاف انگریزی حکومت کی نوکری تلاش کرنی شروع کی۔ سرسید نے اپنے خالو سے، جو دلی کے صدر امین تھے، عدالتی اور قانونی کام سیکھنا شروع کیا اور کچہری میں چھوٹے مقدمات کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ سرسید کے تعلقات مسٹر رابرٹ ہملٹن سے گہرے تھے اس لیے جب وہ آگرہ میں کمشنر بن کر آئے تو ان کی مدد سے کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کی ملازمت اختیار کی۔ منصفی کے عہدہ کے لیے منعقد ہونے والے امتحان میں کامیاب ہو کر ڈپلوما حاصل کیا۔ 1841ء میں مین پوری کے منصف مقرر ہوئے اور دو ہفتے بعد ہی وہ فتح پور سیکری بھیج دیے گئے جہاں وہ چار سال تک خدمت انجام دیتے رہے۔ وہاں شہنشاہ اکبر کی خوابگاہ ایک عالیشان مکان کی شکل میں موجود تھی اس میں سرسید چار سال مقیم رہے۔ بڑے بھائی کے انتقال پر دلی میں

اپنے تبادلے کے لیے درخواست دی اوران کا تبادلہ دلی میں منصفی کے عہدے پر ہو گیا۔

1842ء میں بہادر شاہ ظفر نے سر سید کو 'جواد الدولہ سید احمد خاں آصف جنگ' کے خطاب سے نوازا۔ 1846ء سے 1854ء تک دلی ہی میں رہے۔ اسی درمیان مختصر مدت کے لیے دو مرتبہ قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر روہتک ہریانہ بھیجے گئے۔ 1855ء میں انگریز حاکم ٹامس نے انھیں بجنور میں صدر امین مقرر کیا۔ سوا دو سال تک بجنور میں رہے اور پھر 1857ء کے ہنگامے کے بعد انھیں مراد آباد میں ترقی دے کر صدر الصدور کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ 1862ء میں مراد آباد سے غازی پور تبادلہ ہو گیا۔ 1864ء میں سر سید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا اور پھر 1867ء میں علی گڑھ سے بنارس بھیج دیے گئے۔

2.4.1 سر سید کا سفر انگلستان

انگریز حکومت نے ذہین ہندوستانی طلبا کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے اسکالر شپ منظور کی تھی۔ حسن اتفاق سے سر سید کے صاحبزادے سید محمود اس اسکالر شپ کے اہل قرار پائے۔ سر سید نے طے کیا کہ وہ بھی سید محمود کے ساتھ انگلستان جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے سفر کے انتظامات کیے اور یکم اپریل 1869ء کو اپنے دونوں بیٹوں یعنی سید حامد اور سید محمود اور ایک ملازم کے ساتھ انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جہاں ان کا قیام سترہ مہینے تک رہا۔ اس سفر کا مقصد انگریزوں کی ترقی کا راز جاننا اور وہاں کے طریقہ تعلیم' نصاب تعلیم' اصول تدریس' تہذیب و تمدن اور ثقافت و معاشرت کا بذات خود قریب سے مشاہدہ کرنا تھا۔

لندن کے زمانہ قیام میں سر سید نے ولیم میور کی متنازعہ کتاب "لائف آف محمد" کا رد لکھا۔ یہ کتاب خطبات احمدیہ کے نام سے شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں انہوں نے لندن کے اخبارات اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے طرز پر اردو میں ایک رسالہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا جو "تہذیب الاخلاق" کی شکل میں سامنے آیا۔ لندن ہی میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک کالج کے قیام کا بھی منصوبہ بنایا۔ سر سید نے اپنے سفر انگلستان کے احوال اپنے مشہور سفر نامے "مسافران لندن" میں تحریر کیے جو اردو کا ایک اہم سفر نامہ ہے۔

2.5 تصانیف اور اداروں کا قیام

آگرہ کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر کام کرتے ہوئے سر سید نے اپنی پہلی تاریخی کتاب 'ترتیب دفتر' کا دستور العمل اور فارسی زبان میں ایک فہرس نقشہ 'جام جم' مرتب کیا جو 1840ء میں شائع ہوئی۔ یہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی مختصر تعارفی کتاب تھی۔ قوانین دیوانی کا ایک مجموعہ متعلقہ منصفی 'انتخاب الاخویں' تیار کیا جو منصفی کے عہدے کی تیاری کے لیے گائیڈ بک کے طرز کا رسالہ تھا۔ وہ خود اور ان کے بھائی اس کتاب کے ذریعے منصفی کا امتحان دے کر پاس ہوئے۔ مین پوری اور فتح پور سیکری میں ملازمت کے دوران سیرت نبوی پر 'جلاء القلوب بذکر المحبوب' کے عنوان سے ایک رسالہ تالیف کیا۔ اس کے علاوہ 'تحفہ حسن' اور 'تسہیل فی جر الثقیل' (1844ء) بھی مرتب و ترجمہ کر کے شائع کیا۔ دلی تبادلہ ہو کر آنے کے بعد بھائی کے جاری کردہ اخبار 'سید الاخبار' کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ آثار قدیمہ کے موضوع پر بے حد اہم تصنیف 'آثار الصنادید' میں دلی اور قرب و جوانب کی قدیم عمارتوں کی تفصیلی تاریخ مرتب کی۔

یہ 1847ء میں شائع ہوئی۔ دلی کے کلکٹر اور مجسٹریٹ مسٹر رابرٹس نے اس کتاب کو لندن کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا گیا جہاں اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی تیار کیا اور انگریز حکمرانوں کی فرمائش پر انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا جو مکمل نہیں ہو سکا۔ 1861ء میں مشہور فرانسیسی اسکالر اور مستشرق گارساں دتاسی نے اس کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا جو بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس طرح سرسید یورپ کے با اثر اعلیٰ طبقہ میں متعارف ہو گئے۔

دلی میں منصفی کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے سرسید نے انگریزوں کے مطالبے پر 'فوائد الافکار فی اعمال الفرجار' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ 'قول متین در ابطال حرکت زمین' بھی تصنیف کیا۔ پیری مریدی اور بیعت کے رواج کے خلاف 'کلمتہ الحق' تصنیف کیا۔ سنت کی حمایت اور بدعت کے خلاف ایک رسالہ 'راہ سنت ورد بدعت' بھی شائع کیا۔ 'نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ'، 'سلسلۃ الملوک' اور 'آغاز کیمیائے سعادت' جیسے رسائل شائع کروائے۔ بجنور میں دوران ملازمت 'تاریخ ضلع بجنور' مرتب کی۔ اس کے علاوہ 'آئین اکبری' کی تصحیح اور تکمیل کی۔ مرادآباد کی ملازمت کے دوران سرسید نے 'تاریخ سرکشیِ بجنور' شائع کی۔ 1859ء میں سرسید نے مرادآباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا کیونکہ یہاں کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ انھوں نے اردو اور انگریزی میں ایک رپورٹ مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں شائع کروائی جس میں انگریزی حکومت پر زور ڈالا کہ انگریزی گورنمنٹ صرف انگریزی تعلیم کے مدارس اور اسکول قائم کرے جس سے مسلمانوں کی ترقی ہو۔ کیونکہ اردو یا دیگر دیسی زبانیں مسلمانوں کی علمی ترقی کے لیے بے کار ہیں۔ نہ تو ان زبانوں میں مناسب تعلیمی مواد موجود ہے اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے ان زبانوں میں اتنی استعداد ہے جس کی وجہ سے علم کی ترقی ناممکن ہے۔

غدر کے بعد بقول حالی مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھیرانے کے لیے کافی تھا۔ انگریزوں کے علاوہ غیر مسلم ہندوستانی بھی سابق حکمرانوں کے ہم مذہبوں سے اپنے بغض نکال رہے تھے۔ ایسے نازک وقت میں اور بے حد حساس موضوع پر سرسید نے ایک رسالہ 'اسباب بغاوتِ ہند' لکھا۔ اس کی ایک جلد گورنمنٹ کو بھیجی۔ 1860ء میں 'لائل محمڈنز آف انڈیا' کے نام سے تین رسائل ہندوستانی مسلمانوں کی حکومت سے وفاداری اور دفاع میں لکھے۔ ایک اور رسالہ 'تحقیق لفظ نصاریٰ' بھی لکھی جو ایک غلط فہمی کے ازالے کے طور پر تھا کہ مسلمان، عیسائی اور انگریز کو 'نصاریٰ' تحقیر کے طور پر کہتے ہیں۔ مرادآباد میں ہی سرسید نے آئین اکبری کی طرح تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کر کے ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع کروائی۔ بائبل کی تفسیر قران سے موازنہ کے ساتھ 'تبین الکلام' لکھی۔ جب مرادآباد سے غازی پور تبادلہ ہوا تو سرسید نے وہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کے علاوہ ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ 1864ء ہی میں سرسید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا اور سائنٹفک سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ علی گڑھ میں سرسید نے 'علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن' قائم کی۔ 1866ء میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے اخبار نکالا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے سرسید کی زندگی بھر جاری رہا۔ 1867ء میں ایک بار پھر ان کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس کر دیا گیا۔

ایک عیسائی مصنف سر ولیم میور نے اپنی تصنیف 'لائف آف محمد' میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں غلط معلومات جمع کر کے نہ صرف مغربی ممالک بلکہ ہندوستان کے نو تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کے ذہنوں کو پراگندہ اور مشکوک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نامعقول

تصنیف کے برے اثرات کے تدارک کے لیے سرسید نے 'خطبات احمدیہ' کے عنوان سے ایک کتاب اردو میں تصنیف کی جس کے مختلف حصے انگریزی میں بھی لندن کے قیام کے دوران شائع کیے۔

1876ء میں سرسید کالج کے قیام کے مقصد سے پنشن لے کر علی گڑھ آئے اور مدرسہ اور کالج کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ سرسید نے ملک کے مختلف شہروں کے دورے کیے۔ اسٹیج شو کیے اور کالج کے لیے چندہ جمع کیا۔ 1878ء میں سرسید کو وائسرائے کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا۔ 1882ء میں وہ ایجوکیشن کمیشن کے ممبر مقرر کیے گئے۔ انگریز حکومت نے سرسید کو 'نائٹ کمانڈر آف دی اسٹار آف انڈیا' کا خطاب دیا۔ 'سر' کا لقب ان کے نام کا حصہ بن گیا۔

2.5.1 سائنٹفک سوسائٹی

سرسید احمد خاں جب غازی پور میں تعینات تھے تو انہوں نے وہاں 1863 / 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا۔ اس کے اراکین میں ہندو، مسلم اور عیسائی شامل تھے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد:

اس سوسائٹی کے کے اہم مقاصد یہ تھے:

1۔ **علمی تراجم:** انگریزی اور مغربی زبانوں کی مفید سائنسی اور تاریخی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تاکہ عام ہندوستانی ان کتابوں کے مطالب سمجھ سکیں۔

2۔ **سائنس کو فروغ دینا:** مسلمانوں میں سائنسی مزاج اور عقلیت کو فروغ دینا۔

3۔ ایشیاء کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور عمدہ کتابوں کی تلاش اور ان کی اشاعت۔

سوسائٹی نے مذہبی کتابوں سے سروکار نہ رکھا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے سائنس، تاریخ اور زراعت جیسے موضوعات پر متعدد انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے شائع کیے۔ سائنسی اور علوم و فنون سے متعلق جلد معلومات کی اشاعت کے لیے سائنٹفک سوسائٹی اخبار جاری کیا۔ سوسائٹی سائنس کے کمالات اور ایجادات کے بارے میں لیکچروں کا انعقاد بھی عمل میں لاتی تھی۔ جب سرسید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہو گیا تو سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ آ گیا۔ علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیوں کو نہایت وسعت حاصل ہوئی۔ یہاں اس کے لیے ایک عمارت تعمیر کی گئی جسے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کا نام دیا گیا۔

2.5.2 مدرسۃ العلوم

سرسید سمجھتے تھے کہ تعلیم ملک اور قوم کی تمام بیماریوں کا واحد علاج اور ترقی و عروج کا زینہ ہے۔ لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنے برادرانِ وطن سے بہت پیچھے ہیں، جس کی وجہ سے وہ سماجی، معاشی اور ثقافتی پستی کا شکار ہیں۔ سرسید نے نامساعد اور ناموافق حالات میں تعلیم کی ترویج کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا۔

قوم کے نونہالوں کو عصری علوم و فنون کی تعلیم فراہم کرنے کی غرض سے 24 مئی 1875 کو سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ اس کا افتتاح مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر کی صدارت میں ہوا۔ مولوی سمیع اللہ مدرسے کے پہلے طالب علم تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ایچ جی آئی مڈن مدرسے کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر کیے گئے۔

اس مدرسے کے قیام کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو جدید سائنسی علوم اور انگریزی کے ساتھ دینی تعلیم سے بھی آراستہ کرنا تھا۔ اپنے قیام کے دو سال بعد یہ مدرسہ ایم اے او کالج میں تبدیل ہو گیا۔

ایم اے او کالج:

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام 1877ء میں عمل میں آیا۔ 8 جنوری 1877 کو اس وقت کے وائسرائے اور گورنر جنرل لاڈر لیٹن نے کالج کی پہلی عمارت اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کالج کے لیے سرسید نے برطانوی حکومت سے 74 ایکڑ زمین حاصل کی تھی۔ اس جگہ پہلے ایک فوجی چھاؤنی تھی۔

ایم اے او کالج کے قیام کا مقصد برطانیہ کے شہر آفاق تعلیمی اداروں آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر برصغیر کے مسلمانوں کی نئی نسل کو مغربی علوم و فنون کی تعلیم دینا تھا۔ ہنری جارج اِمپی سڈسن اس کالج کے پہلے پرنسپل تھے جو مدرسۃ العلوم کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ 1883ء میں ان کے مستعفی ہونے کے بعد تھیوڈور کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد 1920ء میں ایم اے او کالج ایک ایکٹ کے ذریعے یونیورسٹی میں بدل گیا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

2.5.3 محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید احمد خاں نے 27 دسمبر 1886ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔ کانفرنس کے قیام کے بنیادی مقاصد یہ تھے:

1۔ برصغیر کے مسلمانوں میں جدید مغربی تعلیم کی ترویج و اشاعت
2۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے لے تجاویز پیش کرنا
3۔ مسلمانوں کو سیاسی اور علمی طور پر باشعور بنانا

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ مولانا حالی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور شبلی نعمانی جیسی شخصیات اس کانفرنس سے وابستہ تھیں۔

2.6 سرسید اور 1857ء

سرسید کو بجنور میں صدر امین کے عہدے پر فرائض انجام دیتے ہوئے سوا دو سال ہوئے تھے کہ 1857ء کا غدر برپا ہو گیا۔ یہ

میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت تھی جو 10 مئی کو شروع ہوئی۔ باغیوں نے 11 مئی کو دہلی پر قبضہ کرکے بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سرسید نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بجنور میں مقیم سبھی انگریزوں کی جان بچائی۔ مقامی نواب انگریزوں کے خلاف تھا اس نے سرسید اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کیا۔ سرسید کا مکان اسباب سب لوٹ لیا۔ سرسید جان بچا کر میرٹھ بھاگے لیکن راستے میں بار بار لوگوں کی بھیڑ انھیں مارنے کے لیے گھیر لیتی۔ ایک رئیس نے سرسید کو بھیڑ کے نرغے سے نکالا۔ سرسید شکستہ حال میرٹھ پہنچ پائے۔ بغاوت کا ہنگامہ میرٹھ سے شروع ہو کر دلی پہونچا تھا لیکن میرٹھ پر انگریزوں نے جلد ہی قابو پا لیا تھا۔ سرسید کو انگریزوں نے وفاداری کا صلہ دیا اور انھیں نہایت احترام کی نظر سے دیکھا۔ تقریباً چھ مہینے سرسید میرٹھ میں رہے۔ سرسید کو دلی کے بارے یہ خبر ملی کہ انگریز فوج نے دلی میں ان کے گھر اور اسباب کو لوٹ لیا ہے۔ سرسید کے ماموں اپنے بھائی کے ساتھ قتل کر دیے گئے ہیں۔ جب سرسید اپنی ماں کی خبر لینے آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کی والدہ اور خالہ نے ایک لاوارث بڑھیا زینن کی کوٹھری میں پناہ لے رکھی ہے۔ خدا کی شان کہ یہ وہی زینن تھی جسے سرسید کی والدہ نے اپنا بیش قیمتی معجون کھلایا تھا اور خدا کے فضل سے خود بغیر معجون صحت یاب ہو گئی تھیں۔ سرسید کی والدہ اور خالہ کا حال یہ تھا کہ گھوڑوں کے کھانے کے دانوں سے بھوک مٹا رہی تھیں۔ دو دنوں سے پانی ختم ہو گیا تھا اس لیے پیاس کی شدت سے نڈھال ہو چکی تھیں۔

حالی نے سرسید کی زبانی یہ انتہائی دل دوز بیان یوں نقل کیا ہے ”جب میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انھوں نے کواڑ کھولے اور پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ ہَیں! تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں، تم چلے جاؤ، ہم پر جو گذرے گی گذر جائے گی۔ میں نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے۔ میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور دلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ تب ان کی خاطر جمع ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش میں نکلا۔ کنووں پر ایسی کوئی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جا سکے اور چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ میں سیدھا پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا وہی زینن بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اٹھا نہ گیا۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں ان کے لیے پانی لے جاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا وہ پانی پی کر لیٹ گئی۔ میں دوڑتا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انھوں نے خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جاؤں۔ باہر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ زینن مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر میں باوجود یہ کہ حکام نے بھی احکام جاری کیے، کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ لے جاتی ہے وہ ان کو مل جائے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔“ سرسید کی والدہ مسلسل بھوک اور پیاس کی تکلیف کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھیں اور اسی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا۔

غدر میں سرسید کی وفاداری کی وجہ سے انگریزوں نے ان کے مشورے کا پاس رکھا اور بجنور کے سبھی مسلمانوں کو غدار تصور نہیں کیا۔ سرسید کی رائے تھی کہ جو ہندوستانی انگریزی فوج کا مقابلہ کرے وہ غدار ہے لیکن جو فوج کے سامنے حاضر ہو جائے وہ وفادار رعایا میں شمار

کیا جانا چاہیے۔ سرسید حکومت کی نظر میں وفادار اور خیر خواہ تھے کیونکہ سرسید نے اپنے خیالات ہی نہیں بلکہ عملی طور پر حکومت اور اس کی پالیسیوں کا دفاع کیا تھا۔ اس لیے وہ فرد واحد ہونے کے باوجود مختلف محاذ پر بے قصور ہندوستانیوں خصوصا یوپی کے مسلمانوں کو انگریزوں کے قہر اور عتاب سے بچایا۔ سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور اور اسباب بغاوت ہند جیسی کتابیں لکھ کر حکومت کی درست رہنمائی کی اور بے قصور مسلمانوں کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کی۔

غدر میں انگریزوں کی جان بچانے کے عوض انگریزی سرکار نے سرسید کو یوپی میں بڑی جاگیر اور زمینیں دینے کی پیشکش کی لیکن سرسید نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور یہ عذر ظاہر کیا کہ وہ اب ہندوستان میں نہیں رہیں گے۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ سرسید نے اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہندوستان چھوڑ کر ولایت میں بس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ حکومت کے اہم عہدے پر خدمت انجام دینے اور ہندستان میں انگریزی حکومت کے سب سے بڑے حامی کے طور پر شہرت رکھنے کے باوجود مرادآباد میں ایک غیر مسلم ہندوستانی کلرک کی جھوٹی شکایت پر سرسید کے گھر چھاپہ مارا گیا اور مکان کی تلاشی لی گئی۔ یہ واقعہ نہایت افسوس ناک اور حوصلہ شکن تھا۔

سرسید کا خیال تھا کہ اب مسلم قوم نہ تو دوبارہ پنپ سکتی ہے نہ عزت پا سکتی ہے۔ لیکن جب وہ بجنور سے ترقی پا کر صدرالصدور کے عہدے پر مرادآباد میں فائز ہوئے اور وہاں کے مسلم رئیسوں کی تباہی و بربادی دیکھی تو اپنا ارادہ بدل دیا۔ سرسید کہتے ہیں "میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" حالی کے بقول سرسید کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہو گا اس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے انگلستان کا سفر کیا۔ سرسید کے موقف کی تائید اس طرح بھی ہوئی کہ لندن میں برطانوی ملکہ معظمہ نے ہندوستانی رعایا کے لیے عام معافی کا اشتہار عام کر دیا۔

2.7 شخصیت اور قومی خدمات

سرسید بچپن سے ہی نہایت آزاد خیال اور فعال شخصیت کے حامل تھے۔ بچپن ہی سے ان میں ہونہاری کے آثار نمایاں ہونے لگتے تھے۔ سرسید اکثر تنہا بھی بادشاہ کے دربار خاص چلے جاتے تھے۔ تیراکی اور تیر اندازی سے شغل رکھتے تھے۔ جاہلی رسومات' شرک اور بدعت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ جوانی کے دنوں میں اعلیٰ طبقے کے نوجوانوں کی طرح رہن سہن اور وضع قطع اختیار کی اور رنگینیوں میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں خود بخود سخت پابند شرع ہو گئے۔

سرسید ایک محب وطن ہندوستانی تھے جو اپنے ملک کے سبھی باشندوں کے لیے بلا لحاظ مذہب و ملت گہری ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ غیر ملکی فاتحین سے بھی کوئی تعصب نہیں برتتے تھے۔ سرسید نے ان خوبیوں کا ثبوت نہ صرف قولی بلکہ عملی سطح پر بھی دیا جس کا ہر کوئی معترف رہا۔ سرسید کے بارے میں کم از کم ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر ہند میں ان سے قبل اور ان کے بعد اتنی

باعمل سرگرم اعلی انسانی خوبیوں کی حامل، انسانی اصلاح، فلاح، ترقی کی فکر رکھنے اور ان کو عملی شکل دینے میں کامیابی حاصل کرنے والی کوئی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے ہندوستانی تاریخ پر اتنے دیر پا اور دوررس اثرات مرتب کیے ہوں۔ سرسید نے سارے اصلاحی کام انتہائی نامساعد حالات میں انتہائی مثبت انداز میں، مثبت فکر و عمل کے ساتھ کرنے میں کامیاب رہے۔ سرسید ایک عالی ہمت، وضع دار اور عملی انسان تھے۔ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر سے اور عملی طور پر فاتح انگریز حکمرانوں کے دلوں میں سبھی ہندوستانیوں کے لیے بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بالخصوص نرم گوشہ پیدا کرنے، تعصب اور شکوک دور کرنے کی ان تھک کوششیں کیں جن کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ سرسید کے اس انفرادی موقف اور کوشش کے نتائج توقع سے بڑھ کر سامنے آئے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ 1857ء کے قبل اور بعد ہندستانیوں کی آواز اجنبی غیر ملکیوں تک پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ سرسید نے ذاتی کوشش سے پہلی ہندوستان کی قومی مجلس قائم کی جس کی نقل میں ہندوستان کے مختلف سماج کے گروہوں نے بھی اپنی اپنی تنظیمیں قائم کیں۔ ان میں ایک تنظیم کانگریس بھی تھی۔ ان ہی کوششوں کی وجہ سے 1862ء کے کونسل اجلاس میں پہلی بار پٹیالہ، بنارس اور گوالیار کے ہندو راجاؤں کے نمائندے شامل ہوئے۔ یہ انگریز حکومت کے دلوں میں ہندوستانیوں کے لیے کشادگی پیدا کرنے کی سرسید کی کوششوں کی جیت تھی۔ سرسید نے 1866ء میں 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' قائم کی تھی۔

سرسید کی دو قومی خدمات اہم ہیں جن کی خصوصی نشاندہی ضروری ہے۔ پہلی خدمت ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کی راہ کھولنے کی ہے جس پر ان کی دنیا اور دنیا کی ترقی کا انحصار تھا- قدیم معاش کے ذرائع، قدیم زبان، تعلیم اور سیاسی نظام کے خاتمے سے مسدود ہوگئے تھے۔ جدید سرکاری زبان، تعلیم اور سیاسی و معاشی نظام سے ہندوستانی مسلمانوں کو وحشت اور دشمنی کی حد تک نفرت تھی۔ بنگال، مدراس، بمبئی میں انگریز حکومت کے مراکز ہونے کی وجہ سے اور راجہ رام موہن رائے جیسے سماجی مصلحین کی کوششوں سے ہندو قوم نے جدید زبان، تعلیم اور سیاسی نظام پر مہارت حاصل کرلی تھی اور مسلمانوں سے آگے نکل چکی تھی۔ سرسید نے خود اعلی سرکاری عہدوں پر مثالی کام کیے، سروس کمیشن کے ممبر بن کر تعلیم اور سماجی اصلاح سے مسلم قوم کو دیگر ہندو برادرانِ وطن کی طرح ترقی کی دوڑ میں شامل کرنے کی کوششیں کیں۔ دوسری اہم قومی خدمت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف طبقات ہمیشہ مذہب کے نام پر مختلف تنگ نظر علما کے زیر دست رہے اور ہر سماجی اصلاح کو مذہب پر حملہ یا دخل اندازی سمجھ کر بھڑکائے جاتے رہے تھے۔ دقیانوسی علما نے سرسید کے سامنے بڑی رکاوٹیں کھڑی کیں، مخالفت اور دشمنی کا طوفان برپا کیا، سرسید کے قتل سازشیں ہوئیں، قاتلانہ حملے ہوئے۔ لیکن سرسید نے بڑے خلوص اور حوصلہ مندی سے مسلم سماج میں رائج ہر خرابی کو اپنی تقریر، تحریر اور عملی اقدام سے ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی اور مسلمانوں میں بھی جدید فکر و عمل کا حامل باشعور اور بااثر سماجی گروہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔

سرسید نے اردو زبان کی بقا اور فروغ کے لیے بے مثال کوششیں کیں۔ انہوں نے نہ صرف اردو زبان بلکہ اردو صحافت اور اردو ادب میں انقلابی اصلاحات کر کے انھیں وقار عطا کیا۔ سرسید نے اردو ادب کی جو خدمت کی اس پر شبلی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ سرسید کے کارناموں میں اصلاح کی مسلسل کوششیں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، ان اصلاحات میں اردو ادب کی اصلاح بھی اہم ہے۔ سرسید سے قبل اردو ادب عشق و عاشقی کے دائرے میں میں گرفتار تھا جسے سرسید نے آزاد کر کے سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور سائنسی ہر قسم کے

مضمون ادا کرنے کے لائق بنایا۔ اردو نثر کو شاعری کے اثرات سے پاک کر خالص نثر بنایا جو سادگی، صفائی، وضاحت اور صراحت کے ساتھ ہر قسم کے مضمون ادا کر سکے۔ بقول شبلی اردو کی استاد فارسی کو بھی ایسی صلاحیت نصیب نہیں جس مقام پر سر سید نے اردو کو پہنچا دیا۔

2.7.1 صحافتی خدمات

سائنٹفک سوسائٹی اخبار:

یہ اخبار 30 مارچ 1866ء کو سائنٹفک سوسائٹی سے جاری ہوا۔ اس کا ایک نام "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" بھی تھا۔ گزٹ کے اجراء سے سر سید کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے ملک و قوم میں نئے خیالات کی ترویج ہو۔ اس اخبار نے منصوبہ بند طور پر یہ کوشش کی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان منافرت کے جذبات کم کیے جائیں۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس زمانے کے چوٹی کے علما اور مصنفین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار میں اس دور کے دوسرے اخبارات کے برخلاف اداریے بلاناغہ باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ٹائپ کے حروف میں چھپتا تھا اور پابندی سے وقت معین پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایک کالم میں اردو متن اور دوسرے کالم میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا جاتا تھا۔

تہذیب الاخلاق:

یہ ایک علمی' اصلاحی اور معاشرتی رسالہ تھا جسے سر سید احمد خاں نے انگلستان کے سفر سے واپسی کے بعد 24 دسمبر 1870 کو علی گڑھ سے جاری کیا تھا۔ اس رسالے میں تمام مضامین اردو میں شائع ہوتے تھے۔ اس کو جاری کرنے کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تہذیب اور سائنس کے فائدوں سے واقف کروانا تھا تاکہ وہ ایک مہذب' باشعور اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ یہ اخبار 1876ء میں بند ہوا۔ لیکن تین سال بعد دوبارہ جاری ہوا لیکن بہت جلد بند ہو گیا۔ تیرہ چودہ برس بعد تیسری مرتبہ پھر سے شائع ہونے لگا اور تین سال جاری رہا۔

اس پرچے کے ذریعے مسلمانوں اور اردو زبان کو بے حد فائدہ پہنچا۔ مسلمانوں میں بیداری آئی اور اردو نثر کو سادہ اور سلیس اسلوب حاصل ہوا۔

2.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- سر سید کا شمار برصغیر ہند کے اہم مصلحین میں ہوتا ہے۔
- سر سید 17 اکتوبر 1817ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔
- سر سید کے جد امجد نے عرب سے ایران ہجرت کی۔
- وہ ہرات میں بس گئے اور شاہجہاں کے دور میں ہندوستان آئے۔
- ان کے والد سید محمد متقی مغل بادشاہ اکبر شاہ کے درباری تھے۔

- سرسید کے ناناخواجہ فرید انگریزوں کے قائم کردہ کلکتہ مدرسہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔
- سرسید کے والد کی سفارش پر 1815ء اکبر شاہ ثانی نے انھیں کلکتہ سے بلا کر دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب سے نوازا اور اپناوزیر مقرر کیا۔
- سرسید کی تربیت اور تمام واقعات زندگی میں ان کی والدہ کا بڑا دخل رہا ہے۔
- سرسید کا بچپن والدہ اور خاندان کے بزرگوں کی نگرانی میں گزرا جب وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر بادشاہ کے دربار جایا کرتے تھے۔
- سرسید کے ایام شباب رئیس طبقے شرفا کے نوجوانوں کی طرح ہی گذرے۔
- والد کی موت کے بعد سرسید نے اپنے ددھیال کے افراد اور بزرگوں کے بر خلاف انگریزی حکومت کی نوکری تلاش کرنی شروع کی۔ سرسید کے تعلقات مسٹر رابرٹ ہملٹن سے گہرے تھے اس لیے جب وہ آگرہ میں کمشنر بن کر آئے تو ان کی مدد سے کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کی ملازمت اختیار کی۔
- 1842ء میں بہادر شاہ ظفر نے سرسید کو 'جواد الدولہ سید احمد خاں آصف جنگ' کے خطاب سے نوازا۔
- 1855ء میں انگریز حاکم ٹامس نے انھیں بجنور میں صدر امین مقرر کیا۔
- 1857ء کے بعد ترقی پاکر بجنور سے مرادآباد گئے اور صدرالصدور کے عہدے پر فائز کیے گئے۔
- 1857ء کے ہنگامے کے دوران بجنور میں سرسید نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہاں مقیم سبھی انگریزوں کی جان بچائی۔
- سرسید کو دلی کے بارے میں یہ خبر ملی کہ انگریزوں کی فوج نے دلی میں ان کے گھر اور اسباب کو لوٹ لیا ہے اور ان کی والدہ اور خالہ نے ایک لاوارث بڑھیا کی کوٹھری میں پناہ لے رکھی ہے۔ وہ بدقت دلی پہنچے اور دونوں کی جان بچائی۔
- 1836ء میں سرسید کی شادی ان کی خالہ زاد بہن پارسا بیگم سے ہوئی تھی۔ 1861ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔
- سرسید نے 1864ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کا مقصد انگریزی اور مغربی زبانوں کی مفید سائنسی اور دیگر علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ بعد میں یہ سوسائٹی سرسید کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی۔
- علی گڑھ میں سوسائٹی کے دفتر کی عمارت تعمیر ہوئی جس کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا۔ یہیں سے سوسائٹی کا اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکلتا تھا۔
- 24 مئی 1875ء کو سرسید نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کیا جس کا مقصد مسلم بچوں کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔
- مدرسۃ العلوم مسلمانان ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں تبدیل ہوا۔ اس کالج کا سنگ بنیاد 8 جنوری 1877ء کو انگریز گورنر جنرل لارڈ لیٹن نے رکھا۔ یہی کالج آگے چل کر 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہوا۔
- سرسید نے 1869ء میں انگلستان کا سفر کیا تا کہ انگریزوں کی علمی و تہذیبی ترقی، انگریزوں کے نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس کا قریب سے مشاہدہ کر سکیں۔

- سرسید نے 30 مارچ 1866 کو سائنٹفک سوسائٹی اخبار جاری کیا جس کا دوسرا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی ہے۔
- سرسید نے 24 دسمبر 1870 کو اپنا مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔
- سرسید نے 27 دسمبر 1886ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔
- 26 مارچ 1898ء کو سرسید نے وفات پائی۔

2.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	::	الفاظ	:	معنی
مصلح	:	اصلاح کرنے والا رہنما	::	نو آبادیاتی	:	مقبوضہ
استحصال	:	ناجائز فائدہ اٹھانا	::	تسلط	:	غلبہ
ثقافت	:	تہذیب	::	مثبت	:	تعمیری
زوال	:	کمزوری، تباہی	::	صورت حال	:	موجودہ حالت
پسماندہ	:	پیچھے رہ جانے والا سماجی گروہ	::	فرنگی	:	انگریز
بیدار	:	ہوشیار، جگا ہوا	::	دبیر الدولہ	:	سلطنت کے محرر
اجداد	:	باپ دادا، اسلاف، پرکھے	::	امین الملک	:	سلطنت کا قابل اعتماد
وضع دار	:	مہذب	::	تدارک	:	تلافی، علاج
شغف	:	بہت لگاؤ، گہرا تعلق	::	انسیت	:	محبت، اخلاص
جواد الدولہ	:	سلطنت کا سخی اور فیاض شخص	::	پر آشوب	:	خطرناک، فتنے فساد کا زمانہ

عقد ثانی : دوسری شادی، یہاں مراد مسلم بیوہ خاتون کی دوسری شادی

بسم اللہ خوانی : گھر یا مکتب میں تعلیم کی ابتدا کرنے کی رسم

خاطر جمع رکھنا : اطمینان سے رہنا، مطمئن ہو جانا

تحریک : ترغیب دینا، ابھارنا، حرکت دینا

آئین نو : جدید اور نیا طور طریقہ، قانون، دستور

طرز کہن : پرانا، فرسودہ اور قدیم طریقہ

بنی فاطمہ : حضرت علی علیہ السلام کی وہ اولاد جو بی بی فاطمہ کی نسل سے ہو یعنی اصل سادات

بنی امیہ : امیہ بن عبد شمس کے اخلاف جو بنی ہاشم کے حریف اور حضرت علی علیہ السلام کے عہد خلافت سے لے کر بنو عباس کے دور حکومت تک دمشق کے حکمراں تھے

2.10 نمونہ امتحانی سوالات

2.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ سرسید کہاں پیدا ہوئے؟

(a)غازی پور (b)بجنور (c)دلی (d)میرٹھ

2۔ سرسید کے والد کا نام کیا تھا؟

(a)سرسید ہادی (b)سید برہان (c) خواجہ فرید (d)سید محمد متقی

3۔ "حیات جاوید" کس کی تصنیف ہے؟

(a)الطاف حسین حالی (b) محسن الملک (c) شبلی (d)نذیر احمد

4۔ سرسید کے نانا کا نام کیا ہے؟

(a)سید عماد (b) خواجہ فرید (c) سید مہدی (d)میر متقی

5۔ سرسید نے کس شہر میں نائب منشی کی ملازمت اختیار کی؟

(a)بجنور (b)مراد آباد (c)آگرہ (d)بنارس

6۔ کس انگریز حاکم نے سرسید کو بجنور میں صدر امین مقرر کیا تھا؟

(a)لیٹن (b) اسٹریچی (c) شیکسپیر (d) ٹامس

7۔ سرسید مراد آباد میں کس عہدے پر فائز کیے گئے؟

(a)صدر الصدور (b) نائب منشی (c)صدر امین (d) ڈپٹی کلکٹر

8۔ سرسید کی پہلی تاریخی تصنیف کون سی ہے؟

(a)انتخاب الاخوین (b) جام جم (c) تحفہ حسن (d)سید الاخبار

9۔ 'تبین الکلام' کس مقدس کتاب کی تصنیف ہے؟

(a)قران (b) توریت (c) انجیل (d) زبور

10۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام کس شہر میں ہوا؟

(a)دہلی (b) بجنور (c)علی گڑھ (d)غازی پور

2.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ سرسید کے بچپن کے بارے میں لکھیے۔

2۔ سرسید کے ایام شباب کا ذکر مختصر طور پر کیجیے۔

3۔ سرسید کے آباواجداد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟لکھیے۔

4۔ سرسید کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

5۔ سرسید کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ سرسید کی والدہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

2۔ سرسید نے 1857ء کے نازک حالات میں کس طرح ملک اور قوم کی خدمت کی؟ مفصل بیان کیجیے۔

3۔ سرسید کی ملازمتوں اور تصانیف پر بھرپور روشنی ڈالیے۔

2.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ حیات جاوید	الطاف حسین حالی
2۔ سرسید احمد خاں	افتخار عالم خاں
3۔ مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق
4۔ سرسید اور ہندستانی مسلمان	نورالحسن نقوی
5۔ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین

2.10.1 کے جوابات

c۔1	d۔2	a۔3	b۔4	c۔5
d۔6	a۔7	b۔8	c۔9	d۔10

اکائی 3: سر سید کی ادبی و صحافتی خدمات

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 سر سید کی ادبی خدمات

3.2.1 تاریخی کتب

3.2.2 تحقیقی کتب

3.2.3 ادبی کتب

3.2.4 مذہبی کتب

3.2.5 سیاسی اور سماجی کتب

3.3 سر سید کی صحافتی خدمات

3.3.1 سید الاخبار

3.3.2 تہذیب الاخلاق

3.3.3 علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

3.3.4 اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی'

3.4 اکتسابی نتائج

3.5 کلیدی الفاظ

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

سر سید احمد خاں انیسویں صدی کے ماہر تعلیم، سیاست داں، دانشور، فلسفی، مفسر، مورخ، ادیب اور صحافی نیز دوراندیش انسان تھے۔ وہ برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے عظیم علمبردار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے عوام بالخصوص مسلمانوں میں تعلیم کے تئیں بیداری کی تحریک پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سر سید نے 1837ء میں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی کے فرائض انجام دیے اور 10 / جنوری 1842 میں فتح پور منتقلی کے بعد ایک مذہبی رسالہ "جلاء القلوب بذکر المحبوب" تالیف کیا۔ اسی عرصے میں اپنی مشہور کتاب "آثارالصنادید" (1847ء) لکھی۔ اس کے بعد اپنے مطالعے کو وسعت دے کر بڑی بردباری سے مذہبی، سیاسی، تاریخی، تحقیقی، تنقیدی اور تفسیری کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کو انھوں نے ادبی نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے تصنیف کیا، جن میں سلاست، حلاوت، افادیت، مبالغہ سے پاک اور طول طویل عبارات سے اجتناب کیا گیا ہے۔ علم اور ادب کو فروغ دینے کے لیے سر سید نے صحافت سے بھی بڑے بڑے کام لیے۔ صحافت نگاری ان کی زندگی کا اہم اور منفرد پہلو ہے۔ صحافت کے ذریعے انھوں نے خفتہ قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی رسائل اور اخبارات شائع کیے۔ اس اکائی میں ہم سر سید کی ادبی اور صحافتی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- سر سید کے تاریخی شعور اور ان کی تاریخی کتب سے واقف ہو سکیں۔
- سر سید کی تحقیقی اور تدوینی مہارتوں سے آگاہ ہو سکیں۔
- سر سید کی مذہبی، ادبی، سیاسی اور سماجی صلاحیتوں سے باخبر ہو سکیں۔
- سر سید کی صحافتی خدمات سے واقف ہو سکیں۔

3.2 سر سید کی ادبی خدمات

3.2.1 تاریخی کتب

تاریخ نویسی سے سر سید کی دلچسپی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ شوق اُن کی زندگی کے ابتدائی دور سے آخری دور تک نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور تصانیف "آثارالصنادید"، "تاریخ بجنور"، "تاریخ سرکشی بجنور" اسی ذوقِ تاریخی کی زندہ مثالیں ہیں۔ عہد قدیم کی تاریخوں سے دلچسپی کے ساتھ عہد جدید کی تاریخوں سے بھی ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ محض عمومی تاریخ ہی نہیں بلکہ تاریخ کے ذیلی شعبوں میں بھی ان کی گہری دلچسپی رہی۔ سکہ شناسی اور فرامین کے موضوع پر ان کے مضامین اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ سکہ شناسی کے اسی

شغف کے تحت انھوں نے ایک مستقل کتاب لکھنے کا آغاز کیا تھا جو اگرچہ ادھوری رہ گئی، مگر اس کا قلمی نسخہ آج بھی مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے اور سرسید کے علمی ذوق و تحقیقی رجحان کی ایک قیمتی یادگار شمار ہوتی ہے۔ سکوں پر لکھی عبارت پڑھنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا لہٰذا ہندوستانی قدیم سکوں کے علاوہ انگریزی سکوں پر بھی انھوں نے مضامین تحریر کیے ہیں۔

1۔ **آثار الصنادید**-: تاریخ کے موضوع پر سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کرنے والی سرسید کی کتاب "آثارالصنادید" ہے۔ اس کتاب کی معنویت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک طویل عرصہ ہو جانے کے باوجود بھی یہ کتاب آج بھی دلی کے آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کے سیاق میں اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ فتح پور سیکری سے تبادلے کے بعد دہلی میں سرسید کو کم و بیش آٹھ سال کے قیام کا موقع ملا، جہاں سرسید کو اپنے علمی ذوق میں اضافہ اور تالیف و تصنیف کے کام میں زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کو "آثار الصنادید" لکھنے کی تحریک فارسی کی کتاب 'سیر المنازل' سے ملی ہو گی، لیکن عام طور پر محققین کا خیال ہے کہ سرسید نے 'آثار الصنادید' سر طامس مٹکاف کی تحریک یا ایما پر لکھی تھی۔ بہر حال 29 سال کی عمر میں سرسید نے 'آثار الصنادید' تصنیف کرنے کی ابتدا 1846ء میں کی اور بڑی محنت و کاوش سے ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل کر کے 1847ء میں شائع کرایا۔ زیر نظر کتاب کے پہلے ایڈیشن میں چار ابواب تھے، جس کی ترتیب جغرافیائی اعتبار سے ہے۔ پہلے باب میں مغلیہ عہد سے قبل کی عمارتوں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں مغلوں کے قلعہ کی عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں شاہجہاں آباد شہر کا بیان ہے۔ آخری اور چوتھے باب میں دلی اور وہاں کے عوام کا بیان شامل ہے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد سرسید نے اس میں مزید اضافوں کی گنجائش محسوس کی نیز ایڈورڈ طامس نے بھی سرسید کو اس کام کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں کافی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ دوسرے ایڈیشن کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا۔ علاوہ ازیں گارساں دتاسی نے 1861 میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع کر کے اس کی ایک جلد سرسید کو بھی ارسال کی تھی۔ اس ترجمہ پر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سید احمد خاں کو اپنا فیلو بنایا۔ یہ کتاب دہلی کی عمارات، مقابر، اہل علم و فن کے احوال، مختلف نقشوں اور کتبوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے بہت سراہا۔ اس کتاب کی تیاری میں سرسید کو بہت محنت و مشقت کرنی پڑی۔ وہ چھٹی کے دن شہر کے باہر جا کر عمارتوں کی تحقیق کرتے۔ خستہ و شکستہ حال عمارتوں کی تحقیق ایک دشوار کام تھا۔ بعض کتبے بھی مخدوش تھے، جن کو پڑھ کر ان سے صحیح معلومات اخذ کرنا، کتبوں کے چربے تیار کرنا اور شکستہ عمارتوں کے نقشے بنوانا آسان نہیں تھا۔ قطب مینار کے کتبے پڑھنے میں جو دشواریاں سرسید کو پیش آئیں اور جس طریقہ سے انھوں نے ان کو حل کیا اس کے متعلق خود سرسید کا بیان ہے کہ کتبوں کو پڑھنے کے لیے ایک چھینکا دو بلّیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بنوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے: (1) بیرون شہر کی عمارتیں، (2) شہر کی عمارتیں، (3) قلعہ کی عمارتیں اور (4) دہلی کے مشاہیر کا تذکرہ۔ پہلے تین ابواب میں دو سو سے زائد عمارات اور دوسرے آثار کا احوال ہے۔ چوتھے باب میں ایک سو بیس مشاہیر کے حالات ہیں جن میں علما، فقرا، اطبا، شعرا، خوش نویس، مصور اور دیگر اہلِ کمال کو شامل کیا گیا۔ الغرض "آثارالصنادید" سرسید کی تاریخی ہی نہیں بلکہ تحقیقی حیثیت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ اس کی پہلی اشاعت سے سرسید کی تلاش و جستجو اور ذوقِ تحقیق مترشح ہوتی ہے جبکہ دوسری اشاعت میں

ان کے جدید اصولِ تحقیق سے روشناس ہونے اس کے طریقِ کار سے واقف ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔زیر نظر کتاب کی تصنیف میں سرسید احمد خاں کو کتنی مشقتوں سے دوچار ہونا پڑا، اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعض بہت بلندی پر لکھے ہوئے کتبوں کو پڑھنے کے لیے انھوں نے ایک چھینکا بنوایا تھا جو دو بلیوں کی مدد سے اس کتبے کے متوازی لٹکایا جاتا تھا، جس کا چربہ اتارنا چاہتے تھے۔

2-**تاریخ بجنور:** ضلع بجنور کی تاریخ بیان کرتی ہے جو 1857ء کے ہنگامے کی نذر ہوگئی۔

3-**تاریخ سرکشی بجنور:** بجنور میں 1857 کی جنگِ آزادی کے دوران ضلع بجنور میں ہونے والی ہنگامہ آرائیوں اور خود سرسید کے ذاتی حالات و خدمات کا مستند احوال درج ہے۔1857 کی جنگِ آزادی کے وقت سرسید احمد خان بجنور میں بطور صدر امین تعینات تھے اور حالات کے عینی شاہد تھے، یہی وجہ ہے کہ اس میں نواب محمود خان کی جانب سے بجنور پر قبضے اور انگریز حکومت کی وفاداری میں سرسید کی جدوجہد کا تفصیل سے ذکر ہے۔یہ تصنیف بجنور کی مقامی تاریخ کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ 1857 کے عہد کی عینی شاہد اور اہم ترین تاریخی ماخذ مانی جاتی ہے۔

3.2.2 تحقیقی کتب

سرسید کی دور بیں نگاہوں نے آثار قدیمہ کی اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کرلیا تھا۔وہ اولین ہندوستانی محقق ہیں جنھوں نے آثار قدیمہ کے موضوع پر علمی اور محققانہ انداز پر روشنی ڈالی یہاں تک کہ تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے انگلستان تک کا باضابطہ سفر بھی کیا۔ تحقیق کے علاوہ انھوں نے تصحیح، ترتیب اور تدوین کا بھی کام انجام دیا۔ انھوں نے اپنے تحقیقی و تدوینی کارناموں میں تاریخی متون کی صحت وترتیب سے متعلق کام انجام دیا۔اس سلسلہ میں انھوں نے "جام جم"، "سلسلۃ الملوک"، "تصحیح آئین اکبری"، "تاریخ فیروز شاہی" اور "تزک جہانگیری" کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا۔ سرسید کی تدوینی کتاب جام جم اور سلسلۃ الملوک اہم کارنامے ہیں۔جام جم تیموری سلسلہ سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے جب کہ سلسلۃ السلوک میں دہلی کے ان سارے بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں جن کا تاریخ میں تذکرہ ہے۔

1۔جام جم: یہ سرسید احمد خان کی پہلی تاریخی و تحقیقی تصنیف ہے۔واقعہ یہ ہے کہ 1839ء میں جب سرسید کو آگرہ میں کمشنری میں نائب منشی کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔وہیں ان کی ملاقات ایک کمشنر رابرٹ ہیملٹن سے ہوئی، جن کی فرمائش پر سرسید نے "جامِ جم "تحریر کی اور 1840 میں اشاعت سے ہمکنار ہوئی۔یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔اس کتاب میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے 43 بادشاہوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے دورِ حکومت کی مکمل تفصیلات درج ہیں۔اس میں بادشاہوں کے آباواجداد کے نام، بادشاہوں کی پیدائش، تخت نشینی اور وفات کی تاریخیں درج ہیں۔اس طرح یہ کتاب ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے اوراس میں شامل مواد حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس کتاب نے سرسید کو ایک مورخ اور محقق کے طور پر متعارف کرایا۔

2۔سلسلۃ الملوک – 1852 میں شرف المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں سرسید نے دہلی کے اُن قدیم بادشاہوں، راجاوں کے مختصر احوال قلمبند کیے ہیں جنھوں نے گزشتہ پانچ ہزار سال تک دہلی پر حکومت کی۔حالانکہ یہ ایک مختصر رسالہ ہے پھر بھی اس کے توسط سے پانچ

ہزار برس کے دہلی کے حکمرانوں کی مجموعی فہرست ایک نظر میں سامنے آ جاتی ہے اور ان حکمرانوں کے نام مع ولدیت سنہ جلوس، دار السلطنت اور ان کے عہدِ حکومت وغیرہ کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ اس میں راجا یدھشٹر سے ملکہ وکٹوریہ تک حکمرانوں کی فہرست شامل ہے۔ سلسلۃ الملوک اور آثارالصنادید کے موضوع کی یکسانیت کو دیکھتے ہوئے، زیر نظر کتاب کو آثارالصنادید کے دوسرے ایڈیشن میں اصلاح و اضافہ کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

3۔ **تصحیح آئین اکبری:** آئین اکبری کی تصحیح و تدوین ان کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ دراصل ابوالفضل کی مشہور تصنیف "آئین اکبری" کی تصحیح ہے، جس میں مغلیہ سلطنت کے نظامِ حکومت اور اس کے مختلف حصوں کے متعلق تاریخی، اقتصادی، ثقافتی اور دیگر معلومات کا ذکر ہے۔ اس کی تصحیح اور اشاعت کا مشورہ دہلی کے ایک تاجر قطب الدین نے اس وقت دیا تھا جب سرسید دہلی میں مقیم تھے۔ سرسید کو یہ تجویز پسند آگئی، لہٰذا بجنور پہنچتے ہی تصحیح کا کام شروع کر دیا۔ اس کے لیے سرسید نے کتاب کے متعدد نسخے جمع کیے اور سب کا تقابل کر کے متن کی تصحیح کی، اس کے مشکل مقامات کی وضاحت، عربی و فارسی، ترکی اور سنسکرت کے نامانوس اصطلاحوں کی تشریح اور بے شمار تصویروں کا اضافہ فنِ تاریخ سے سرسید کی غیر معمولی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔ بہت سے الفاظ اور اصطلاحات جو تشریح طلب تھیں، ان کی تشریح کر کے پہلی اور تیسری جلد شائع کی۔ اس پر غالب نے سرسید کی فرمائش پر 38 اشعار پر مشتمل تقریظ لکھی۔ لیکن سرسید نے اس تقریظ کو اپنی مرتّبہ کتاب میں شامل نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ناقدین کی مختلف آراء ہیں کہ سرسید کو غالب کا یہ ترقی پسندانہ انداز پسند نہیں آیا۔ "آئین اکبری" کی دوسری جلد کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہوگئی کیونکہ اس میں محاصل سے متعلق بعض ایسے اعداد تھے جو سبھی نسخوں میں مختلف تھے۔ چنانچہ سید احمد خاں نے ایک دیگر کتاب کی مدد سے ان اعداد کی تصحیح کی اور ایک طویل مقدمے کے ساتھ پریس بھیجی، لیکن انھیں ایام میں غدر ہو گیا، جس سے دوسری جلد کا تمام مسودہ غدر کی نذر ہو گیا۔

4۔ **تاریخ فیروز شاہی:** ضیاالدین برنی کی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح سرسید نے بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے سیکریٹری کی فرمائش پر کی۔ اس میں بھی سرسید نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا۔ انھوں نے بڑی تندہی سے ایک مستند نسخہ تیار کر کے 1862ء میں شائع کرایا۔ ضیاالدین برنی کی یہ کتاب اپنے وقت میں بھی بہت اہمیت کی حامل تھی۔ اور سرسید کی ترتیب و تصحیح کے بعد اور بھی مستند مانی جانے لگی۔

5۔ **تزک جہاں گیری:** تاریخ سے متعلق لکھی گئی تصنیفات میں "تزک جہانگیری" کی ترتیب و تصحیح سرسید کا آخری تاریخی کام ہے۔ اگرچہ تاریخ سے ان کی دلچسپی اور رغبت ختم نہیں ہوئی تھی لیکن سرسید قوم کی اصلاح، فلاح و بہبود اور دوسرے فلاحی کاموں میں زیادہ مصروف ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی ترتیب و تصحیح پر زیادہ توجہ مبذول نہیں کر سکے۔ سرسید نے زیر نظر کتاب کی مختلف نسخوں کی مدد سے ترتیب و تصحیح کر کے اس کا پہلا ایڈیشن 1863ء میں غازی پور سے شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن 1864ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔

3.2.3 ادبی کتب

سرسید کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اُردو ادب کو مختلف جہات اور گوناگوں صلاحیتوں سے متاثر کیا۔ ان کی ادبی تحریریں مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری جیسے رجحانات پر استوار ہیں۔ انھوں نے اردو ادب میں ایک طویل عرصے سے

رائج ماورائی قصوں اور مافوق الفطری واقعات کو منہا کر کے آسان اور عام فہم طرزِ تحریر، نیز جدید اسلوبِ بیان کی اساس مہیا کرائی۔ سرسید کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں متنوع موضوعات، منفرد اسلوب بیان کے ساتھ نئے افکار وخیالات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو پستی سے نکال کر اس کے اندازِ بیان میں سلاست اور قوت پیدا کی۔

انھوں نے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھے جو افادیت سے خالی نہیں ہیں۔ انھوں نے اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت زبان وادب سے متعلق ایسے بے بہا مضامین قلم بند کیے جو آنے والے مصنفین کے لیے اساسی درجہ رکھتے ہیں۔ زبان وادب سے متعلق سرسید کے بعض مضامین درج ذیل ہیں:

(1) قواعد صرف ونحو (2) علامات قرات (3) اردو زبان کا بیان (4) اردو زبان کے بیان میں (5) ترقی علم انشا (6) اردو نظم (7) نظم کی تعلیم (8) تدبیر ترقی نظم (9) ہماری خط وکتابت میں اصلاح کی ضرورت (10) ہمارا علم ادب (11) مسدس بطور مرثیہ: مسلمانوں کی قوم کی تباہ حالت پر (12) کیا اردو زبان کے اشعاروں سے ہر حالت میں اردو زبان کے لیے استناد ہو سکتا ہے؟ (13) متعلق اردو وناگری۔

عربی زبان وادب سے متعلق سرسید کے دو مضامین "مرثیہ مصائب اندلس" اور "عربی زبان" لائق مطالعہ ہیں۔ سرسید نے سنسکرت زبان وادب کے حوالے سے ایک مضمون "زبان سنسکرت کے قدیم قلمی نسخے" قلمبند کیا تھا، جو گوناگوں اہمیت کا حامل ہے۔

سرسید نے اپنی عملی اور اصلاحی کوششوں سے اردو ادب کی تمام اصناف میں اصلاحات کیں۔ انھوں نے نثر، شاعری، طنز ومزاح، سفر نامہ نگاری اور مکتوب نگاری میں اصلاحات کر کے عبارت کو سلیس اور آسان فہم بنانے کی ترغیب دی۔ نثر کے ساتھ ساتھ سرسید نے شاعری میں بھی کئی اصلاحات کیں۔ انھوں نے اپنے نظریات وخیالات سے شعر وادب کی تمام جہتوں کو متاثر کیا اور اسے نو آبادیاتی تناظر میں دیکھنے اور جانچنے پر زور دیا۔ انھوں نے شعر وادب کو اجتماعیت سے روشناس کرایا۔ اس میں انھوں نے مقصدیت اور افادیت کو ترجیح دی۔ سرسید نے جب مغربی ادب پاروں اور فن پاروں کا مطالعہ کیا تو ان میں موجود خصوصیات سے بہت متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریزی شعر وادب کو نمونہ عمل قرار دیا۔ انھوں نے نثر میں بذات خود نیا طرز اظہا و اسلوب اختیار کیا اور براہ راست اردو نثر کے دھارے کو ایک نئی جہت عطا کی۔ شاعری کے سلسلہ میں بھی انھوں نے سادگی اور نئے مضامین کے بیان پر زور دیا۔ وہ ادب اور شاعری دونوں میں سادگی، افادیت، مقصدیت اور اصلاح کے قائل تھے۔ وہ اردو شعر وادب کو کارآمد اور مفید بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب اور شاعری سے قوم کی اصلاح اور تربیت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو اپنے نظریات سے متاثر ضرور کیا لیکن تخلیقی مذاق نہ ہونے کی وجہ سے عملاً گریز کیا۔

سرسید نے ادب بالخصوص اردو ادب کی ترقی کے لیے جو ہمہ جہتی خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے اُردو ادب کو موضوعاتی، لسانیاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے متاثر کرنے کے علاوہ اردو ادب کی دیگر اصناف مثلاً تحقیق، تنقید، مضمون نگاری، مقالہ نگاری، خطوط نویسی اور سوانح نگاری کے لیے بھی راستے ہموار کیے۔ سرسید کی تحریروں میں ٹھوس علمی حقائق اور ادبی تنقید نیز سنجیدہ تحریریں ملتی ہیں۔ روزمرہ اور محاوروں کا لطف بھی سرسید کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سرسید کی نثر میں محاکات کا لطف بھی ملتا ہے۔ وہ محاکات کی مدد سے ایسے مناظر کھینچتے ہیں کہ وہ مجسم معلوم ہونے لگتے ہیں۔ سرسید کے مضامین میں بے تکلف روزمرہ کا انداز اور محاورہ کا حسن ایک

خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ ان کے یہاں تمثیلی انداز میں بھی جدت پائی جاتی ہے۔ اس قبیل کے مضامین میں "امید کی خوشی، آدم کی سرگزشت" ہیں۔

3.2.4 مذہبی کتب

تصنیفات سے متعلق سرسید کی دلچسپیاں ہمہ جہت تھیں۔ وہ بیک وقت تاریخ، تحقیق، تدوین، ترتیب، تصحیح، ادب، مذہب اور سیرت پر قلم اٹھانے کی یکساں صلاحیت رکھتے تھے۔ اس قبیل کی کتابیں درج ذیل ہیں:

1۔ تفسیر القرآن وھو الھدی والفرقان (1880): یہ تفسیر سے متعلق سرسید کا عظیم کارنامہ ہے، اس میں سرسید نے پہلے قرآنی آیتوں کا ترجمہ پیش کیا ہے اس کے بعد تفسیر بیان کی ہے۔ تفسیر میں سرسید نے سائنٹفک انداز اپنایا ہے۔ یہ 16 پاروں پر مشتمل ہے اور سرسید کا اہم کارنامہ ہے۔ اس کی چھ جلدیں منظر عام پر آئی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس تفسیر میں سورہ طٰہٰ تک کی تفسیر ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سورہ طٰہٰ کی تفسیر موجود نہیں، صرف اس کا ترجمہ ہے۔ اس کے آگے تفسیر کے کام کو وہ آگے نہیں بڑھا سکے۔ یہ تفسیر سورہ مریم (پارہ نمبر 16؛ سورہ نمبر 19) تک ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تفسیر نصف قرآن کی ہے۔ تفسیر کی اولین تین جلدوں کے بعد چوتھی جلد میں سرسید کے وہ مختصر مضامین شامل کیے گئے ہیں جو قرآنی آیات کی مختصر تشریحات پر مبنی ہیں۔ اس میں سرسید نے جدید سائنسی علوم اور عقل کی روشنی میں قرآنی آیات کی تعبیر کی اور روایتی نظریات سے ہٹ کر اپنا موقف پیش کیا ہے۔ انھوں نے قرآن کو فطرت کے قانون کے مطابق قرار دیا ہے۔ معجزات کی عقلی تاویل کرکے روایتی معجزات کے ظاہری مفہوم سے اختلاف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے علماء نے اس کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

2۔ تحریر فی اصول التفسیر: سرسید نے تفسیر لکھنے سے قبل اس کے بعض اصول بھی واضح کیے تھے۔ یہ اصول ایک کتابچہ کی صورت میں "تحریر فی اصول التفسیر" کے عنوان سے 1892ء میں مطبع مفید عام، آگرہ سے شائع ہوا تھا، اس سے سرسید کے تفسیری نکات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس میں سرسید نے قرآن فہمی کے پندرہ اصول بیان کیے ہیں۔

3۔ خطبات احمدیہ: سرسید غیر مسلموں کی طرف سے آنحضرت ﷺ پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہا کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" ہے جسے مختصر طور پر "خطبات احمدیہ" کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کو سیرتِ نبوی ﷺ پر اردو زبان میں تصنیف کی جانے والی اولین علمی و تحقیقی تصنیف ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

"خطباتِ احمدیہ" کا مطالعہ کرتے ہوئے سر عقیدت سے جھک جاتا ہے کہ ایک ایسے عہد میں، جب بڑے بڑے علما موجود تھے مگر مستشرقین کی یلغار کے مقابلے میں خاموشی طاری تھی، سرسید واحد شخصیت کے طور پر سامنے آئے جنھوں نے نہ صرف جرات کے ساتھ قلم اٹھایا بلکہ دلائل، حوالوں اور مآخذ کی روشنی میں ان اعتراضات کا علمی جواب دیا۔ انھوں نے خود مستشرقین کی تحریروں ہی کو بنیاد بنا کر یورپ میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں پھیلائے گئے مسخ شدہ، غلط اور تعصبانہ تصورات کو بے نقاب کرکے ان کا محققانہ ردّ پیش کیا۔

دراصل یہ سر ولیم میور کی کتاب "Life Of Mohammad" (چار جلدیں) میں آپ ﷺ پر کیے گئے بے جا اعتراضات اور مذہبِ اسلام کو حقیر ثابت کرنے کی کوششوں اور غلط فہمیوں کا مدلل جواب ہے۔ اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے بہت سی اسلامی اور دیگر کتابوں کا

مطالعہ درکار تھا جو ہندوستان میں دستیاب نہیں تھیں۔ لہٰذا سرسید نے سفر انگلستان کا قصد کیا کیونکہ وہاں اسلامی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کتابوں اور وہاں کی لائبریریوں سے بھی استفادہ حاصل کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن انگلستان کے سفر اور وہاں قیام کے لیے سرسید کے سرمایہ نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے اس سفر کے لیے اپنا کتب خانہ بھی فروخت کر دیا اور گھر بھی رہن رکھ دیا۔ اور اپنے دونوں بیٹے سید محمود اور سید حامد نیز ایک ملازم چھجو کے ساتھ 10 اپریل 1869 کو سرسید بنارس سے انگلستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں انھوں نے 'انڈیا آفس' کے کتب خانہ اور 'برٹش میوزم' کی لائبریری سے استفادہ کرنے کے ساتھ ہی بہت سی اہم کتابیں خرید کر پڑھیں۔ چنانچہ تمام کوششوں اور شب وروز کی مسلسل محنتوں کے بعد "بارہ خطبوں" پر مشتمل "خطبات احمدیہ" کے نام سے 1870 میں لندن سے شائع کی، جنھیں مختصر طور پر اس طرح سمجھا جاسکتا ہے:

(1) پہلے خطبہ میں اسلام کی آمد سے قبل عرب قبائل کی مفصل تاریخ اور اس کے جغرافیائی حالات پر بحث کی گئی ہے، ساتھ ہی توریت کے تناظر میں آپ کا اسماعیلؑ کی اولاد سے ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے۔

(2) دوسرے خطبہ میں اسلام سے قبل عرب کے رسم ورواج، اخلاق، سماجی ناہمواریوں اور ان کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد ان تمام رسومات میں کس قدر اصلاحی تبدیلیاں آئیں۔

(3) تیسرے خطبہ میں اسلام سے قبل عرب کے مذاہب کا ذکر ہے۔ اس کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل اہل عرب چار فرقوں؛ (1) بُت پرست (2) لامذہب (3) خدا پرست (4) معتقدین مذہبِ الہامی میں منقسم تھے۔

(4) چوتھے خطبہ میں مذہب اسلام کو ساری انسانیت کے لیے رحمت بتا کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس مذہب سے دنیا کے دیگر مذاہب کو بھی بڑا فائدہ ہوا۔

(5) پانچویں خطبہ میں مسلمانوں کی مذہبی کتب؛ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اہم تصانیف کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(6) چھٹے خطبہ میں مذہبِ اسلام کی روایات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں اسلامی روایتوں کی حقائق اور ان کے فروغ کے اسباب پر بھی بحث شامل ہے۔

(7) ساتویں خطبہ میں قرآن مجید کے نزول کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

(8) آٹھویں خطبہ میں اسلام سے قبل کے کعبہ اور اس کی تاریخی وسماجی کیفیت، مقام ابراہیم، سکونت اسماعیلؑ وغیرہ جیسے امور زیر بحث آئے ہیں۔

(9) نویں خطبہ میں آپ ﷺ کے نسب نامے سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے تحت یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہیں۔

(10) دسویں خطبہ میں توریت اور انجیل میں آپ کی آمد کے متعلق بشارتوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن میں آمدِ رسول سے متعلق آیات موجود ہیں۔ سرسید نے یہ بھی بتایا ہے کہ قرآنی آیات میں توریت اور انجیل میں آپ کی آمد کی بشارت موجود ہے۔

(11) گیارہویں خطبہ میں معراج کی حقیقت اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ اس میں سرسید نے اپنا عقلی ومذہبی نظریہ بھی پیش کیا ہے۔

(12) بارہویں خطبہ میں آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی کے بارہ سالہ مبارک زندگی کے سوانحی حالات پیش کیے گئے ہیں نیز سر ولیم میور نے آپ ﷺ کے بچپن کی زندگی پر جو اعتراضات کیے تھے، اس کا بھی جواب موجود ہے۔

ان کے علاوہ سر ولیم میور کے دیگر اعتراضات میں آپ کی متعدد شادیاں، اسلام میں متعدد نکاح کی اجازت اور طلاق کا مسئلہ تھا، سر سید نے اس کا جواب توریت کے تناظر میں دیا اور مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ کے دو نکاح، حضرت یعقوبؑ کے چار نکاح اور حضرت داؤدؑ کی نوے سے زیادہ ازواج کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی طلاق کے مسئلہ کا جواب بھی توریت کی روشنی میں دیا۔

4۔ ازواج مطہرات: یہ سیرت کے حوالے سے سر سید کا ایک معرکۃ الآرا مضمون ہے، جسے وہ اپنی پایانِ عمر میں ازواج مطہرات پر لکھ رہے تھے لیکن اسے وہ مکمل نہ کر سکے اور اس مضمون کو ادھورا چھوڑ کر وہ راہی ملک بقا ہوئے۔ یہ رسالہ ایک عیسائی کے رسالہ "اُمَّہات المومنین" کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں حضرت رسالت مآب کی ازواج مطہرات پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ "اُمَّہات المومنین" میں سب سے بڑا اعتراض آنحضرت ﷺ کے تعدد ازدواج پر کیا گیا تھا۔ سر سید نے تعدد ازدواج کے سلسلے میں تشفی بخش جواب دیا اور ہر زوجہ مطہرہ کا الگ الگ اور قدرے تفصیل سے ذکر کیا۔ لیکن یہ مضمون ادھورا رہ گیا اور گیارہ میں سے صرف سات یعنی حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینبؓ ام المساکین اور حضرت زینبؓ بنت جحش کے حالات لکھے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کا حال لکھنے والے تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔

5۔ احکام طعام اہل کتاب: یہ سر سید کا اہم اور تاریخی و تحقیقی رسالہ ہے، جسے 1868 میں تحریر کیا گیا۔ اسے مسلمانوں کے لیے انگریزوں اور انگریزی طرز معاشرت سے پیدا ہونے والی نفرت کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کا اساسی مقصد فرنگیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی و معاشرتی تنفر اور غلط فہمیوں کو دور کر کے باہمی تعلقات کو استوار کرنا تھا۔ چونکہ عام طور پر مسلمان اہل کتاب کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے، لیکن سر سید اس کے خلاف تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنا ایک واقعہ انقلاب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انقلاب کے زمانہ میں بجنور پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہ اور ایک دیگر انگریز افسر 'پامر' ہمسفر تھے۔ راستہ میں دونوں نے چائے پی جو پامر کے ساتھ بوتل میں موجود تھی۔ اس کے کئی سال بعد یعنی 1886 میں ان سے کسی شخص نے یہ بات مسئلہ کے طور پر دریافت کی، جس کا جواب سر سید نے سوسائٹی کے اخبار مورخہ 14 تمبر میں شائع کیا اور آیات و احادیث کا حوالے دے کر ثابت کیا کہ یہ جائز ہے۔ اس کے شائع ہونے پر کسی نے لکھا کہ "میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔" اس کے جواب میں سر سید نے لکھا کہ "میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے۔ اور اس سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اس سے زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ اس لیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب یا سور یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ تامل نہیں کرتا جس چیز میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے۔" چنانچہ اس واقعہ کے دو سال بعد یعنی 1867 میں سر سید نے ایک مبسوط اور مدلل مقالہ بنام "رسالہ احکام طعام اہل کتاب" کے نام سے بنارس میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت پر بہت شور ہوا لیکن جیسا کہ

سید احمد خاں نے خود کہا تھا وہ آندھی کا ایک بگولہ تھا جو خاک اڑا کر چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر مسلمانوں نے اپنا رویہ بدلنا شروع کر دیا۔ معاشرتی اصلاحات کے سلسلہ میں سید احمد خاں کی یہ تصنیف اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں سر سید نے اسلام کی فطری وسعت اور رواداری کو واضح کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلمان تنگ نظری کے خول سے نکل کر جدید دنیا میں قدم رکھ سکیں اور برطانوی دورِ حکومت میں ایک پُر امن معاشرہ تشکیل دیا جاسکے۔ سر سید کی اس تصنیف نے برصغیر کے مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

6۔ ہنٹر کی کتاب پر ریویو: اپنی کتاب (1871) میں ہنٹر نے وہابیوں کے سات بنیادی عقائد پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب دراصل ولیم ہنٹر کی کتاب "دی انڈین مسلمانز" کے رد میں ہے۔ ہنٹر کے اعتراضات اور سر سید کے جوابات اس طرح ہیں:

(i) اللہ تعالیٰ پر کلّی اعتماد۔ ظاہر ہے کہ اس سے سر سید کو کوئی اختلاف نہ تھا۔

(ii) شفاعت سے انکار۔ یہاں سید احمد خاں نے صرف الفاظ کو مبہم کیا ہے۔ معناً ان کو کوئی اعتراض نہیں۔

(iii) مقدس اسلامی کتابوں کی تشریح کرنے اور ان کے مطالب قائم کرنے کی انفرادی آزادی۔ اس میں سر سید نے لفظی ترمیم کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن کا مطلب اپنی سمجھ کے مطابق سمجھنے کا حق ہر ایک کو ہے یعنی کسی پر پہلے ائمہ کی تقلید لازمی نہیں۔

(iv) ظاہری رسوم کا جو مسلمانوں نے اختیار کر لی ہیں، ترک کرنا۔ اس پر سر سید نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

(v) امام کی رہنمائی میں کفار پر فتوحات حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہنا۔ اس پر سر سید کا اعتراض ہے کہ ہنٹر کے الفاظ گمراہ کن ہیں۔

(vi) کفار کے خلاف جہاد پر اعتقاد اور عمل۔ اس میں بھی سر سید کے نزدیک ہنٹر نے بہت زیادتی کی ہے۔

(vii) روحانی مقتدیٰ کی فرمانبرداری۔ سر سید کا کہنا ہے کہ 'روحانی مقتدیٰ' سے ہنٹر کا صحیح منشا معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر دینی پیشوا مراد ہے تو قطعی غلط ہے۔ وہابی اس کی حکم برداری پر عقیدہ نہیں رکھتے اور اگر ان کا منشاء مسلم حکمران ہے تو صحیح ہے۔

سر سید نے اس کتاب میں وہابیت کی تاریخ پر اپنا موقف تفصیل سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے ہنٹر کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ردّ تو کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں اسلامی اور ہندوستانی تاریخ کے بعض واقعات کو جس طرح انھوں نے پیش کیا ہے، اس سے تاریخ کے اکثر طلبا اتفاق نہیں رکھتے۔

7۔ النظر فی بعض المسائل: اس میں قرآن کریم کے حوالے سے چند اہم مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس میں جو نظریات زیر بحث لائے گئے ہیں وہ سر سید کے ایسے متنازع فیہ اور انقلابی نظریات ہیں جو انھوں نے اسلام، سائنس، عقل اور جدید دور کے تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے پیش کیے ہیں۔ چونکہ سر سید نے مذہب کو عقلی اور سائنسی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی بنیاد رکھی تھی یہی وجہ ہے کہ "النظر فی بعض المسائل" کو اس عہد کے متشدد اور روایتی علماء کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں 'نیچری' کا لقب بھی دیا گیا تاہم ان کے افکار نے مسلمانوں میں جدید تعلیم اور سائنسی شعور بیدار کرنے میں ایک تاریخی اور انقلابی کردار ادا کیا۔

8-تحفہ حسن(1844) یہ سرسید کی ابتدائی فارسی تصانیف میں سے ہے۔ یہ کتاب شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مشہور کتاب "تحفہ اثناعشری" کے دسویں اور بارہویں باب کا ترجمہ ہے۔ اس میں اہلِ تشیع کے عقائد کا رد کرتے ہوئے اہلِ سنت کی تائید میں دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

9۔ کلمۃ الحق(1849): یہ بھی پیری مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقہ کے رد میں تحریر کردہ رسالہ ہے۔ اس میں تصوف کے نام پر ہونے والی غیر شرعی اور بیجا رسومات و توہمات اور پیروں کے جاہلانہ طریقوں پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ یہ رسالہ سرسید کی ابتدائی تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔ اسے سرسید نے علی گڑھ تحریک اور مغربی علوم و عقلیت پسندی کی طرف مائل ہونے سے قبل لکھا تھا۔

10۔ راہ سنت و رد بدعت(1850): یہ کلمۃ الحق کی کڑی ہے۔ اسے بھی بدعت کے رد میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں خالص اسلامی تعلیمات کی تائید اور انحراف کی بھرپور مخالفت کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے ذریعہ رائج کردہ غیر شرعی رسوم و رواج کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے سرسید نے احادیث کی روشنی میں خالص سنت نبوی کی تائید کی ہے۔

11۔ نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ: یہ 1852 میں فارسی زبان میں لکھا گیا ایک رسالہ ہے، جو صوفیانہ عقائد اور تصور شیخ کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف کے ان طریقوں کو بتایا گیا ہے جس میں مرید اپنے پیر یا مرشد کی روحانی شخصیت کو اپنے ذہن میں حاضر ناظر سمجھتا ہے۔ اسے تصنیف کرنے کے بعد سرسید نے اس وقت کے مشہور صوفی بزرگ شاہ احمد صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس پر شاہ احمد سعید صاحب نے کہا تھا کہ یہ رسالہ ایک صاحبِ دل ہی تالیف کر سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ رسالہ سرسید کی روحانی توجہ کا نتیجہ ہے۔

12۔ تحقیق لفظ نصاریٰ: یہ تحقیقی مقالہ 1861 میں منظر عام پر آیا۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان واقع بُعد اور بدگمانیوں کو دور کرنا تھا۔ زیر نظر مقالے میں سب سے پہلے سرسید نے لغوی اور تاریخی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ 'نصاریٰ' عربی زبان کا لفظ نہیں ہے، بلکہ یہ عبرانی زبان کے لفظ 'ناصری' سے ماخوذ ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق فلسطین کے شہر 'ناصرہ' سے تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیروکاروں یعنی عیسائیوں کو 'ناصری' کہا جاتا ہے۔ کثرتِ استعمال کے سبب یہ لفظ 'نصاریٰ' بن گیا۔

13۔ رسالہ ابطال غلامی: یہ رسالہ یعنی غلامی کا خاتمہ 1893 میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات کے پس منظر میں غلامی کے رد پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس میں سرسید نے اسلامی تاریخ اور قرآن مجید کے احکامات سے دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ اسلام میں غلامی کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی یہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے۔

14۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب: یہ رسالہ 1843 میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ سرسید احمد خان کا انتہائی اہم، قدیم ترین اور نایاب دینی و سیرتِ نبوی پر مبنی رسالہ ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت، معجزات، وصال اور دیگر حالاتِ زندگی کا پُر درد اور عاجزانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سرسید کے گہرے مذہبی اور عاشقانہ جذبات کی عکاس ہے، کیونکہ بعد میں ان کی توجہ زیادہ تر سائنسی اور تعلیمی مضامین پر مرکوز ہو گئی تھی۔

15۔ تبئین القرآن: اس میں توریت اور انجیل کی تفسیر پیش کی گئی ہے اور ان امور پر توجہ مرکوز کی گئی ہے، جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین مختلف شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور بدگمانی دور ہو۔ چنانچہ تفسیر سے قبل دس مقدمے لکھے گئے ہیں، جن میں

بڑی محنت اور تحقیق کے بعد مصنف نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ اکثر بنیادی امور میں عیسائی اور مسلمان اتفاق رکھتے ہیں مثلاً دونوں فرقے اگلے نبیوں اور ان کے صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ انجیل کی تحریف کے متعلق بھی ان کا موقف دوسرے مسلمانوں سے مختلف تھا۔

3.2.5 سیاسی اور سماجی کتب

1-اسباب بغاوت ہند: 1857ء کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جس اذیت سے دوچار ہونا پڑا، وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس بغاوت میں مسلمانوں کو زیادہ نشانہ بنایا گیا، انھیں پھانسی پر لٹکایا گیا، ان کی زمینیں ضبط کی گئیں یہاں تک کہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی گئی۔ حالاں کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اور بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں بخت خاں، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، ناناصاحب، منگل پانڈے، کنور سنگھ وغیرہ نے مل کر آزادی کا علم بلند کیا تھا لیکن چونکہ مسلمان اس بغاوت میں پیش پیش تھے لہٰذا مسلمانوں کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ ان تمام حالات پر سرسید کی نظر تھی، ان کا دل قوم کی ناگفتہ بہ حالت سے مغموم تھا۔ وہ اس فکر میں مستغرق تھے کہ کس طرح حکام کے دلوں سے مسلمانوں کے لیے نفرت اور غلط فہمی دور کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بری کرنے کے لیے انھوں نے ایک رسالہ تصنیف کیا جو 1859ء میں اشاعت سے ہمکنار ہوا۔

"اسباب بغاوت ہند" کی ابتدا اس سوال سے کی گئی ہے کہ "کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟" اس کے تحت پہلے لفظ 'سرکشی' کے معنی و مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت میں سرسید نے پانچ مثالیں پیش کی ہیں:

1- اول غلط فہمی رعایا یعنی غلط سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

2- جاری ہونا، ایسے آئین اور ضوابط اور طریقہ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کے عادات کے مناسب نہ تھے، یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

3- ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

4- ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

5- بدانتظامی اور بداہتمامی فوج کی۔

اس کے بعد بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور غدر کی وجوہات اور حکومت کی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد بھی انقلابیوں کی شکست کے بعد انگریزی حکومت کے مسلمانوں پر ناقابلِ بیان مظالم ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ انگریز افسروں کے جذبہ انتقام سے ہندوؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ غلط اور بے بنیاد شہادتیں پیش کر کے اپنے پرانے بدلے بھی لیے اور حکومت کی خیر خواہی کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا۔ نتیجتاً سیاسی اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد مسلمان اپنی اقتصادی حیثیت بھی کھو رہے تھے، جس کا سرسید کے دردمند دل پر بہت گہرا اثر ہوا اور انھوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنی قوم کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے انھیں عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ ان کے خیال میں اس کا واحد علاج یہی تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کو قریب لایا جائے اور دلوں

سے بد گمانی اور اپنے ہم مذہبوں کے تعصب کو دور کیا جائے۔ اس عظیم الشان منصوبہ کی تکمیل کے لیے انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، ان کا ذکر دوسرے باب میں کیا گیا ہے۔ سید احمد خاں نے یہ تو تسلیم ہی کر لیا تھا کہ ہنگامہ 1857 در حقیقت فوج کی بغاوت تھی نہ کہ قومی تحریک کا نتیجہ۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے 'بغاوت' کے اسباب پر ایک رسالہ تیار کیا اور انگریزوں کو باور کرایا مسلمانوں کو تباہ کر کے کامیابی کے ساتھ حکومت کرنے کا ان کا خواب قطعاً غلط ہے۔ زیر نظر کتاب میں سر سید نے جن اسباب پر بحث کی ہے، ان میں خاص طور پر دو اسباب قابل ذکر ہیں۔ کمپنی کی حکومت کو نامقبول بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ عیسائی مشنریوں اور ان کو امداد دینے والے انگریز حکام کا تھا۔ اس مسئلہ کو سید احمد خاں نے نہایت تفصیل سے پیش کیا ہے۔ دوسرا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حکومت کی کونسلوں اور دوسرے اہم اداروں میں ہندوستانیوں کی عدم موجودگی کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود اپنی قابلیت اور محنت کے انگریز حکام بغیر یہاں کے لوگوں سے مشورہ کیے ہوئے جو قوانین وضع کرتے تھے، وہ یہاں کے رہنے والوں کی طبیعتوں اور مزاج کے موافق نہیں ہوتے تھے، اس کے لیے سر سید نے درج ذیل اسباب بیان کیے:

(1) عوام کا گورنمنٹ کی تجاویز کو غلط قرار دینا، حکومت کا ایسا طرز اختیار کرنا جو ہندوستانیوں کے مزاج اور عادات کے خلاف ہو، حکومت کی عوام کے حالات اور ان کے مصائب سے ناواقفیت، حکومت کے لازمی امور کا ترک اور فوجی بد انتظامی۔

(2) خواتین کی خود مختاری، زمینوں کی ضبطی اور زمینداروں کی بربادی کو بھی سر سید نے بغاوت کی ایک بڑی وجہ بتائی ہے۔ زمینوں کی ضبطی عوام میں حکومت سے نفرت کرنے کی ایک بڑی وجہ بنی۔ حکومت نے لوگوں سے ان کی آبائی زمینیں ضبط کر لیں اور معاشی طور پر ان کو محتاج کر دیا۔ ان حالات نے کاشتکاروں اور زمینداروں کو مفلس اور حکومت سے متنفر بنا دیا۔

(3) حکومت کی عوام سے ناواقفیت کو بھی سر سید نے سرکشی کا سبب قرار دیا ہے۔ گورنمنٹ ہندوستانیوں کی عادات واطوار اور خیالات سے یکسر نابلد تھی۔ عوام کے مصائب اور دکھ درد کا حکومت کو ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا۔ جو حاکم اضلاع میں متعین کیے گئے تھے وہ عوام کے ساتھ ناروا سلوک کرتے۔ ان کی بدزبانی اور سخت مزاجی نے ہندوستانیوں کو بہت رنجور کر دیا تھا۔ پنشن کا بند ہونا بھی سرکشی کا ایک اہم سبب بنا۔

(4) بادشاہانہ دربار کا نہ ہونا، انگریزی دور حکومت میں ہندوستانیوں کی ترقی نہ ہونا، حکومت کا ہندوستانیوں سے محبت اور اتحاد نہ کرنا، ہندوستانیوں کی بے توقیری اور حکام اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی کو بھی سر سید نے بغاوت کے اہم اسباب میں شمار کیا ہے۔

(5) فوجی بد انتظامی نے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ سر سید نے انگریزی حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر حکومت ہندو اور مسلمان کی الگ الگ فوج تیار کر لے تو اس بغاوت کو رونما ہونے سے پہلے ہی فرو کیا جا سکتا تھا۔

غدر کے اسباب بیان کرنے کے بعد سر سید نے انگریزی حکومت کے طریقہ کار کی اصلاح سے متعلق بھی چند سفارشات پیش کیں۔ ان سفارشات پر برٹش حکومت نے سنجیدگی سے غور کیا اور اکثر سفارشات پر عمل درآمد کی سعی کی۔ سر سید کی سفارش کا ہی نتیجہ تھا کہ 1861ء میں "اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کے ایک سال کے بعد تین ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے اور جنوری 1862ء کے اجلاس میں مہاراجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راو دیوان ریاست گوالیار کو شریک کیا

گیا۔ "اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد 1862ء میں پہلی بار پنڈت شمبھوناتھ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ اس طرح سرسید کی سفارش کی بدولت بڑی بڑی ملازمتوں کے دروازے ہندوستانیوں پر کھل گئے۔

2-رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا(1860): یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ اس میں حکومت کے تئیں وفادار مسلمانوں کا ذکر اس مقصد سے کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کی بدگمانی دور ہو سکے، جسے دور کرنے کے لیے سید احمد خاں نے یہ عہد کیا کہ انگریز حکام کو یہ باور کرایا جائے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد خصوصاً سربرآوردہ مسلمان حکومت کے وفادار تھے اور ہیں۔ اس کے لیے سرسید نے حکومت کے تئیں وفادار اُن مسلمانوں کی فہرست اور مختصر حالات پر مشتمل ایک رسالہ شائع کیا۔ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی یہ بدقسمتی تھی کہ ان کے اچھے کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور دوسری قوموں کے برے کاموں پر بھی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسالہ کی ابتدا سرسید نے خود اپنے اور بجنور کے اپنے دو ساتھی حکام یعنی میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں سے کی۔ ان کا خیال تھا کہ جب انقلاب کے اصل حالات معلوم ہوں گے تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں، سب بند ہو جائیں گی اور ثابت ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یگانگت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی ہیں اور کوئی نہیں۔ لیکن سرسید کی اپیل کا ردعمل بہت زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوا۔ بہت کم لوگوں نے اپنے حالات بھیجے اور رسالہ ایک سال کے بعد یعنی 1861ء میں بند ہو گیا۔

3-سیرت فریدیہ: اس میں سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد (جو مغل دربار میں اہم عہدوں پر فائز تھے) کی حیات، سیرت، خاندانی حالات نیز شخصیت اور کارناموں کے مختلف گوشوں کو آشکار کیا ہے۔ چونکہ سرسید کے نانا کی سیرت و شخصیت کا سرسید کی سیرت و شخصیت پر گہرا اثر پڑا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے نانا کی سیرت اور شخصیت کے نمایاں اوصاف کو اجاگر کیا۔ اس میں سرسید نے اپنے نانا کے مختصر سوانحی حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ خواجہ فرید الدین احمد کی ولادت 1161ھ (1747) دلّی میں ایک کشمیری تاجر گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد محترم کا نام خواجہ اشرف تھا۔ خواجہ فرید الدین کے سات بھائی تھے۔ خواجہ علاء الدین، خواجہ شہاب الدین، خواجہ نور الدین، خواجہ محی الدین، خواجہ نجیب الدین، خواجہ حسام الدین اور خواجہ کمال الدین۔ خواجہ فرید الدین ابتدائی عمر سے تحصیل علم کے بہت شوقین تھے ۔انھیں علوم ریاضیہ سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ علوم ریاضی کے لیے انھوں نے لکھنو کا سفر کیا، اور وہاں تین سال قیام کر کے علامہ تفضّل حسین سے ریاضی کا علم حاصل کیا۔ 1193ھ مطابق 1779ء میں ان کی شادی خواجہ محمد مراد احراری کی صاحب زادی سے ہوئی، جن کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ خواجہ فرید الدین کے یہاں دو بیٹے اور تین بیٹیوں کی ولادت ہوئی۔ سرسید کی والدہ محترمہ عزیز النساء بیگم اپنے والد یعنی سرسید کے نانا کو بہت عزیز تھیں۔

سرسید احمد خاں اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں سرسید نے اپنے نانا اور اپنی والدہ عزیز النساء بیگم کا ذکر خیر کثرت سے کیا ہے۔ سرسید کے بقول وہ ایک مہذب، نیک سیرت، خدا ترس، دانش مند اور دور اندیش خاتون تھیں۔ یہ والدہ کی تعلیم و تربیت ہی کا اثر تھا جس کی بدولت وہ عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک بنے اور ملک و قوم کی خدمت میں اپنی عمر صرف کر دی۔ سرسید نے اپنی والدہ سے متعلق متعدد واقعات اور نصیحت آموز باتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

اس کتاب میں سرسید کے بچپن کے واقعات بھی ہیں۔ سرسید کی تحریر ہونے کے سبب یہ کتاب اُن کے اپنے حالاتِ زندگی اور خاندانی پس منظر کو سمجھنے کے لیے ایک مستند تاریخی ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔

3.3 سرسید کی صحافتی خدمات

اپنے دل میں قوم وملت کا درد رکھنے والے سرسید نے مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے ہر ممکن طریقہ اپنایا۔ وہ قوم کے خیر خواہ، مسلمانوں کے غمگساراورزبان وادب کے تئیں ہمدرد تھے۔ انھوں نے علمی، تعلیمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی میدان میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے، جس کے لیے انھوں نے کتابیں تصنیف کیں، تحریکیں قائم کیں، تنظیمیں بنائیں، رسائل نکالے، مضامین قلمبند کیے اور صحافت کا بھی سہارالیا۔ صحافت نگاری ان کی زندگی کا اہم اور منفرد پہلو ہے، جس کے ذریعہ انھوں نے خفتہ قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ صحافت نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ہماری زندگی کی سانس کی طرح ہے بلکہ یہ کہنے میں عار نہیں ہوگا کہ صحافت ایک کائنات ہے، جس کا کینوس کافی وسیع ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ہمیشہ ہر دور میں اپنی اہمیت اور افادیت رہی ہے لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جیسے علوم وفنون کی مختلف جہتوں کی ترویج واشاعت ہورہی ہے، ذرائع ابلاغ کی ویسے ویسے اہمیت ہورہی ہے کیونکہ تمام علوم وفنون کو فروغ دینے کے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں عوام تک پہنچانے کے لیے رسائل و اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کتابوں کا ہی سہارالیا جاتا ہے۔ تلاش وجستجو اخبار نویسی کی آبرو ہے، صحافت انکشافات ہی کی پروردہ ہے، کیونکہ اطلاع اہم ہو یا غیر اہم، متوقع ہو یا غیر متوقع سعی ہی سے ملتی ہے۔ اردو صحافت ہندوستان کی قدیم ترین اور تاریخی اعتبار سے موثر اور موقر صحافت ہے، ملک کی سماجی زندگی میں اردو صحافت نے تعمیری اور یادگار کردار ادا کیا ہے۔ انگزیری کے علاوہ اردو اور ہندی وہ زبان ہے جس کے جرائد واخبارات ملک کے تقریباً سبھی خطوں سے شائع ہوتے ہیں۔ صحافت بڑی جانفشانی اور ریاضت کا کام ہے، جبکہ کچھ لوگ اسے ایک پر اسرار تجارت سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں ایسے خاص پوشیدہ نکتے بہت کم ہیں۔ یہ ایک مسلسل ہنر ہے، جس میں آئے دن جدید سے جدید تر خیالات و نظریات، افکار اور تجربات سے سامنا کرنا ہوتا ہے، اس کی ہر ایک بات میں جدت اور ہر معاملہ میں کوئی خاص نوعیت ضرور ہوتی ہے۔

سرسید بچپن سے مطالعہ کے شوقین اور لکھنے کے عادی تھے۔ وہ "دہلی اردو اخبار" کا روزانہ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں دہلی اردو اخبار کا ذکر کیا ہے اور اعتراف بھی کیا ہے کہ انھوں نے اپنے تشکیلی دور میں اس اخبار سے مسلسل استفادہ کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اخبار بینی کے بچپن سے ہی شائق تھے اور وہیں سے انہیں مقالہ نویسی کی تحریک ملی۔ سرسید نے اوائل عمری سے مضمون نویسی شروع کردی تھی اور دہلی اردو اخبار کے مطالعہ نے ان کے ادبی ذوق کو مزید مہمیز کیا۔ یہی وہ طاقت تھی جس نے ان کا زندگی بھر ساتھ دیا اور تاریخ، آثار قدیمہ، تصوف، مابعد الطبیعات، اخلاق، تہذیب، رسوم اور معاشرتی اصلاح جیسے موضوعات پر گراں قدر مضامین اور کتابیں لکھنے میں معاونت پہنچائی۔

3.3.1 سید الاخبار

سر سید کی صحافتی زندگی کا آغاز "سید الاخبار" (1841) دہلی سے مانا جاتا ہے۔ یہ اخبار سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں کی سر پرستی میں جاری ہوا تھا، جس کے ایڈیٹر مولوی عبد الغفور تھے۔ یہ اخبار 1848 تک متواتر جاری رہا لیکن جب سید محمد کا انتقال ہو گیا تو اس اخبار کی ساری ذمہ داری سر سید پر آن پڑی۔ کچھ عرصہ تک وہ اس کی اشاعت جاری رکھ سکے لیکن بوجوہ بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کے بند ہو جانے کے بعد دوبارہ سر سید کی صحافت کی ابتدا "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کے توسط سے ہوئی۔

3.3.2 تہذیب الاخلاق

1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برصغیر ہندوپاک ایک ایسے دور سے گذرا، جس کے منفی نتائج سے سر سید بخوبی آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فرنگی حکومت کا طریقہ تعلیم مسلمانوں کے لیے ناکافی اور غیر مفید ہے۔ اس وقت سر سید انگلستان میں تھے۔ وہاں انھوں نے رچرڈ اسٹیل کے اسپکٹیٹر اور ایڈیسن کے ٹیٹلر نامی رسائل کا مطالعہ کیا تھا، جس سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن کو لندن کے پیغمبر اور سویلائزیشن کے دیوتا کہہ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ ان رسائل سے قدرے متاثر ہونے کے بعد ولایت میں ہی سر سید نے ایک رسالہ کو نکالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سر سید نے ان رسائل کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> "ان پرچوں میں صرف علم وادب اور علم انشا ہی میں ترقی نہیں ہوئی بلکہ اخلاق اور عادات اور خصلت کو بھی کچھ ترقی ہوئی۔"

ہندوستان سے ایک رسالہ کے جاری کرنے کا خاکہ تیار کر لینے کے بعد انھوں نے ولایت ہی میں انگریزی زبان میں ایک پمفلٹ شائع کرایا جس کا عنوان "ہندوستانیوں کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراضات" تھا۔ اس پمفلٹ کے پس پشت سر سید کی مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح تھی، جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے انگلستان سے واپسی پر ایک مہینہ 22 دن بعد یکم شوال 1287ھ مطابق 24/ دسمبر 1870 کو ایک رسالہ جاری کیا، جس کا نام "تہذیب الاخلاق رکھا"۔ اس کی اشاعت سے نہ صرف مسلمانان برصغیر کے حقوق کا تحفظ ہوا بلکہ مستقبل قریب میں ان کے سامنے ایک روشن مستقبل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی صورت بھی سامنے آگئی۔ اس پرچہ کی اشاعت کے لیے سر سید نے اپنے رفقا کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی جس میں طے پایا کہ تہذیب الاخلاق کے لیے ہر ممبر سے 60 روپیہ سالانہ اور عام خریدار سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لیا جائے گا۔ ان کا یہ فیصلہ اس رسالہ کی شہرت کے لیے ایک کامیاب قدم ثابت ہوا اور رسالہ کا باقاعدہ طور پر اجرا ہو گیا۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ 1277ھ مطابق 1870 کو شائع ہوا جس کے بعد متواتر چھ برس تک نکلتا رہا۔ ادارت کی ذمہ داری خود سر سید نے سنبھالی۔ چونکہ یہ رسالہ قوم کی ترقی کی خاطر شائع ہوتا تھا اس لیے اس سے ہونے والی آمدنی کو رسالہ کی ترقی میں خرچ کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک تجارتی رسالہ نہ ہونے کے سبب اس کی آخری جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور مونوگرام یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا:

"حب القوم من الایمان فمن یسع فی اعزاز قومہ انما یسعیٰ فی اعزاز دینہ۔"

ترجمہ: قوم کی محبت جزوایمان ہے جس نے قوم کا اعزاز بڑھانے کے لیے کوشش کی اس نے دین کے اعزاز کی کوشش کی۔

ابتدا میں یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا لیکن بعد میں ماہنامہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے مضمون نگاروں میں سرسید کے علاوہ خواجہ الطاف حسین حالی، محسن الملک، وقارالملک، ذکاء اللہ اوراحسان اللہ عباسی وغیرہ تھے۔ یہ رسالہ سرسید کے عہد ہی میں ناگزیر وجوہات کی بناپر تین بار تعطل کا شکار ہوا، جن کی تواریخ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی مرتبہ 24/دسمبر1870ء تا20/دسمبر1876

دوسری مرتبہ 23/اپریل1878 تا28/جولائی1880

تیسری مرتبہ 17/اپریل1893 تافروری1897

تہذیب الاخلاق کے دور اول میں 326 مضامین میں سے 112، دور دوم کے 67 مضامین میں سے 23/اور دورآخر کے تقریباً 73 مضامین سرسید احمد خاں نے خود لکھے جن کا انداز اصلاحی اور افادی تھا۔ اس لحاظ سے سرسید نے تقریباً دوسوباون مضامین لکھے، جن میں ان کے فکری وتہذیبی رجحانات کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ سرسید کو جدید اردو نثر کا بانی اور مقالہ نگاری کا موجد کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ انھوں نے اسٹیل اورایڈیسن کی نہج پر اردو میں مقالہ نویسی کا سلسلہ قائم کیا اور اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ اس کے ذریعے سرسید نے اپنی قوم میں اصلاح اور بیداری لانے کے لیے کوششیں کیں۔ حالانکہ انگلینڈ اور ہندوستان کے ماحول میں بڑا فرق تھا۔ انگلستان میں سکون، عیش، راحت اور علم وادب کی فضا بے حد ہموار تھی جبکہ ہندوستان میں انتشار، بدامنی، افلاس، تنگ نظری، توہم اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا تہذیب الاخلاق کے اجرا اور سرسید نیز ان کے رفقا کو اس قسم کے مضامین لکھنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی ان دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جرأت اور خلوص کے ساتھ سماجی وتہذیبی نوعیت کے مضامین پیش کیے۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا کے مقاصد کے سلسلہ میں سرسید خود لکھتے ہیں:

> "ہمارے اس پرچے (تہذیب الاخلاق) کی عمر سوابرس کی ہوئی اور 63 مضمون اس میں چھپے۔ اب ہم کو سوچنا چاہیے کہ ہم کو اس سے قومی تہذیب اور قومی ترقی حاصل ہونے کی کیا توقع ہے۔ جب ہم کچھ اوپر ڈیڑھ سوبرس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے اور وہاں بھی اس قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے..... خدا نے یہ کام لندن کے پیغمبروں اور سولیزشن کے دیوتا سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن کی قسمت میں لکھا تھا۔" (تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص:447)

درج بالا اقتباس سے مترشح ہوتا ہے کہ سرسید نے ان دونوں مستند مضمون نگاروں کے طرز اور فکر کا تتبع کیا ہے اور انگریزی میں موجود بعض مضامین کا چربہ بھی لیا ہے حالاں کہ سرسید کے یہاں موضوعات میں بہت رنگارنگی ہے۔ ان کا طرز اور اسلوب خصوصیت کا حامل ہے نیز ان کے بیان اور زبان کی سلاست میں انفرادیت ہے۔ سرسید کے مضامین کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اول-خالص مذہبی اور دینی مضامین

دوم-سیاسی مضامین

سوم-اصلاح، اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین۔

سر سید کے انتقال کے بعد 1901 سے دوبارہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت عمل میں آئی، جس کی ادارت کے فرائض محسن الملک نے 1907 تک انجام دیے۔ اس کے بعد وحید الدین سلیم مدیر ہوئے جنھوں نے 1909 تک اشاعت کا انتظام سنبھالا جو تاہنوز جاری ہے۔ رسالہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ابتدائی دور کے صرف چھ ماہ کے مختصر عرصہ میں 622 مضامین شائع ہو چکے تھے، جن میں سے 211 مضامین خود سر سید کے تھے۔ اس کے تقریباً تین برس کے بعد دوبارہ یہ رسالہ جاری ہوا لیکن تین برس پانچ مہینہ کے بعد دوبارہ تعطل کا شکار ہو گیا۔

رسالہ کے اجراء کا مقصد مغرب کی نئی تہذیب وتمدن کے ساتھ عصری علوم وفنون سے بھی ہندوستانی اقوام کو روشناس کرانا تھا۔ اس کے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ اسلام ترقی اور تمدن کا دشمن نہیں ہے بلکہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ اقوام کی طرح مسلمان بھی ترقی یافتہ بنیں۔ ان میں غیر ضروری رسومات کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ تہذیب الاخلاق کے اجراء کا مقصد مذہبی اوہام پرستی سے نجات بھی تھا۔ کیونکہ اس کے اجرا سے قبل ملک میں توہم پرستی عروج پر تھی۔ یہ رسالہ بالکل اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر نہج پر تھا۔ چونکہ ان رسائل کے توسط سے یورپ میں مارٹن لوتھر اور دوسرے مذہبی رہنما پہلے ہی مذہبی رسومات کی کافی اصلاح کر چکے تھے اس لیے مذکورہ رسائل کو مذہبیات کے تذکرہ سے دور رکھا گیا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق بھی اسی راہ پر گامزن ہوا۔ اس طرح تہذیب الاخلاق بھی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا اور مسلمانوں کے ادبی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی معیار کو رونما کرنے میں بھی مضبوط کردار ادا کیا، لیکن اس کے اجرا میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر سر سید نے اس رسالہ کے ذریعہ مسلمانوں میں تعلیم کا شوق بھی پیدا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کی اہمیت وافادیت سے بھی واقف کرایا۔ علاوہ ازیں اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد امت میں سیاسی بیداری، آپسی بھائی چارہ، تفریق کی مخالفت اور جہد مسلسل کی دعوت دینا بھی تھا۔

تہذیب الاخلاق کے مضامین سے اردو کے قاری ہی نہیں بلکہ مصنفین بھی ایک نئی راہ سے روشناس ہوئے۔ اس کے علاوہ ایسے ماحول میں جہاں زیادہ تر مصنفین انگریزی زبان وادب سے ناآشنا تھے اور اردو کی نثر روایتی قصے کہانیوں سے آگے نہیں بڑھی تھی، شاعری بھی صدیوں سے روایتی انداز میں کی جاتی رہی تھی، ایسی روایتی نثر نگاری اور شاعری کے دور میں سر سید نے اس رسالہ کو معاشرتی پرچہ بنانے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کی جانب دلچسپی دلانے کا بھی ذریعہ بنایا۔ اس رسالہ نے ہندوستان اور اردو میں جدید تعلیم کے راستے ہموار کیے، اس کے ساتھ ہی عوام میں جدید تعلیم کے حصول کا شعور پیدا ہوا۔ اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ قوم کے اندر عصری تعلیم کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور ہندوستان میں تعلیمی نظام کو جدید ممالک کے برابر لانے کی کوشش کی گئی۔ چونکہ اس وقت لوگ جدید تعلیم کے حصول کو ایمان میں خلل تصور کرتے تھے اور اسے عام خیال میں کفر سے تعبیر کیا جاتا تھا اس لیے اس رسالہ کے ذریعہ سر سید نے وہ راستہ دکھایا جس کو حاصل کر کے انسان زندگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے موضوعات کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مضامین کا انتخاب خود سرسید کرتے تھے اور اس کے مضمون نگاروں میں خود سرسید کا ایک خاص مقام تھا اور انھوں نے بذات خود اس رسالہ میں بہترین مضامین کے پرچے لکھے۔ زیر نظر رسالہ کے کلیدی مضامین میں تعصب، تعلیم وتربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث وتکرار، سویلزیشن، اپنی مدد آپ، سمجھ، گزراہوا زمانہ، امید کی خوشی، رسم ورواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق، انسان کے خیالات، آزادیِ رائے، تربیت اطفال، سراب حیات، خود غرضی، قومی ہمدردی اور اصلاح تھے۔ رسالہ کے دیگر موضوعات میں عصری تعلیم کی جانب قوم کو متوجہ کرنا، رسم ورواج سے ترک تعلق، آپسی ہمدردی، آزادیِ رائے، عورتوں کے حقوق، تعلیم، کھان پان، اخلاقیات جیسے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ سرسید نے علمائے اسلام مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے مضامین کے تراجم بھی تہذیب الاخلاق میں شائع کیے۔ رسالہ کے بیشتر مضامین میں سرسید نے تہذیب وثقافت کے مباحثے چھیڑے ہیں۔ اپنے آخر الذکر مضمون میں وہ آزادیِ رائے، درستی عقائد مذہبی، خیالات وافعال مذہبی، صدق مقال، دوستوں سے راہ ورسم اور رسم کلام، لہجہ، طریق زندگی، صفائی، طرز لباس، طریق اکل وشرب، تدبیر منزل، غلامی، رسومات شادی، رسومات غمی، ترقی زراعت وتجارت کے تحت مسلمانوں کی تہذیبی وسماجی زندگی میں اصلاح احوال کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا۔ تہذیب الاخلاق کے خاص موضوعات میں مذہب، سماج، سیاست، اخلاقیات جیسے موضوعات بیشتر نظر آتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے سید الاخبار اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے جس علمی وادبی صحافت کا آغاز کیا تھا وہ تہذیب الاخلاق کی صورت میں اپنا سنگ میل عبور کرتی نظر آئی۔

سرسید احمد خاں کی پوری زندگی خاص مقصدیت کے زیر اثر تھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہی مقصدیت اپنے اخبارات ورسائل میں بھی باقی رکھی۔ انھوں نے اپنی تحریکوں اور رسائل واخبارات سے وہی کام لیے جو ان کی زندگی کا نصب العین تھے۔ ان رسائل واخبارات میں زیادہ سے زیادہ سرسید نے مضامین لکھنے کی کوشش کی جس کے ذریعہ اپنے مقاصد کی تشہیر عمل میں آئی۔ تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے زیادہ تر مضامین یا تو سرسید کے ہیں یا ان کے رفقاء کے جو سرسید کے ساتھ ان کے مشن میں برابر کے شریک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین کا اسلوب سادہ، بامقصد، جامع اور حقیقت حال کا عکاس ہے۔ ان کی یہ تحریریں نہ صرف موثر ہوتی تھیں بلکہ ان میں خلوص وصداقت بھی پائی جاتی تھی۔ بطور خاص اس رسالہ میں عام فہم اور سادہ نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے تہذیب الاخلاق کے مصنفین کے یہاں بالعموم اور سرسید احمد خاں کے ہاں بالخصوص استدلالیت، عقلیت اور سائنس پسندی کا رجحان پایا جاتا ہے اور انہیں خدوخال میں تہذیب الاخلاق کا مجموعی اسلوب تشکیل پایا۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید نے زبان وبیان اور اسلوب کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔

سرسید کے مطابق ادب وانشا کا مقصد محض تفریح یا آرائش بیان نہیں ہے بلکہ وہ افادی نظریہ کے تحت معانی ومطالب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مضمون کو طرز ادا پر اولیت حاصل ہے۔ حالی نے بھی حیات جاوید میں ان کے اسلوب اور مقصدیت کے حوالے سے انھیں ریفارمر قرار دیا ہے۔ غرض یہ کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں فکر، زبان سادہ، سلیس، شستہ اور بیان موثر ہے اور اس رسالہ کے ذریعہ ان کی شخصیت میں ایک کامیاب صحافی ہونے کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سرسید کی صحافت نگاری کو دیکھ کر

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو ادب خصوصاً اردو نثر کی ترقی میں سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ'، رسالہ 'تہذیب الاخلاق' اور 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' نے خاص طور پر بڑے اہم کردار ادا کیے۔ اوّل الذکر دونوں اخبار اور رسالے نے تو تحریری طور پر اور کانفرنس نے تقریری طور پر لوگوں کو اردو نثر و شاعری کے نئے رجحانات سے باخبر کرنے اور زبان و ادب کی خدمات انجام دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

3.3.3 علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

'تہذیب الاخلاق' کے اجراء سے قبل 1864 میں سرسید نے غازی پور میں جس سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی، اسی کے تحت 1866 میں ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار سرسید کے آخر دم تک جاری رہا۔ اس اخبار کا ادارتی نوٹ خود سرسید بڑی دلچسپی اور رغبت سے لکھتے تھے۔ یہ اخبار ذولسانی یعنی اینگلوُ اُردو تھا۔ اس میں دو کالم ہوتے تھے، ایک کالم میں اردو اور دوسرے کالم میں انگریزی ہوتی تھی۔ اس اخبار میں تعلیمی، علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات کے ساتھ ساتھ دینی اور اخلاقی موضوعات پر بھی بڑے ہی فکر انگیز مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبارات کے اہم مضامین کے تراجم بھی شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں سائنٹفک سوسائٹی کے تحت جو لیکچرس منعقد ہوتے تھے، ان کے اقتباسات بھی اس اخبار میں شائع کیے جاتے تھے۔ غرض کہ شمالی ہند کے مسلمانوں میں جدید عصری تعلیم اور مغربی علوم و فنون کے تئیں رغبت پیدا کرنے میں اس اخبار نے کلیدی کردار ادا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اہم قلم کاروں میں نواب محسن الملک، مولانا حالیؔ، مولوی ذکاء اللہ، مولوی سمیع اللہ، شبلی نعمانی، نذیر احمد، وحید الدین سلیم، خواجہ غلام الثقلین، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وغیرہ تھے۔ اس میں زیادہ تر چیزیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تو شائع ہوتی ہی تھیں ساتھ ہی عربی اور فارسی زبانوں میں بھی بعض تحریریں چھپتی رہتی تھیں۔ غرض کہ سرسید نے قوم کی دیگر خدمات کے علاوہ اردو ادب اور شاعری کو بھی نہ صرف فیضیاب کیا بلکہ اس میں انقلاب پیدا کر دیا۔

3.3.4 اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی'

یہ اخبار 3/مارچ 1866 کو علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔ ابتدا میں یہ اخبار ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہو گیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے کئی مقاصد تھے، جن کی تکمیل اور اپنے مدعا کی ترسیل کے لیے سرسید نے سائنٹفک اخبار جاری کیا۔ اس اخبار کے ذریعہ بہت سے کام لیے گئے، جن میں مغربی علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنا شامل تھا۔ یورپین اور انگریزی میں رائج جدید موضوعات پر مبنی کتابوں کو ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ یہ کام کتابی شکل میں بھی ہوتا تھا اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ بھی اردو تراجم کی تشہیر عمل میں لائی جاتی تھی۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے اور اس اخبار کے جاری کرنے کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے حالیؔ نے لکھا ہے:

> "ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول بڑھانے اور اس منافرت کو دور کرنے..... اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر سوسائٹی میں لیکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور

گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے قائم کیے جائیں جو اردو انگریزی
دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔"

(حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالیؔ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص:335)

اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' کا مقصد مغربی علوم وفنون کے اردو تراجم کو شائع کر کے ہندوستانی عوام کو واقف کرانا تھا وہیں 'تہذیب الاخلاق' کا مقصد تعلیمی تحریک ورجحانات اور سماجی اصلاح تھا۔ اس کے علاوہ آسان اور سلیس زبان کو فروغ دینے، سادہ اور عام فہم نثر لکھنے کی جو خدمات انجام دی گئی اس نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں اس اخبار کی اہمیت کو اس وجہ سے نہیں فراموش کیا جا سکتا کہ اس اخبار نے جہاں ایک طرف اردو زبان و ادب کو سلاست، ادبیت، شیرینی، اور عام فہم بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہیں اس اخبار کے تحت مسجع ومقفیٰ نثر کی تردید اور انجمن پنجاب کی بھرپور حمایت کی گئی اور نظم ونثر کی اصلاح کے حوالے سے سرسید اور ان کے رفقاء کے مقصد کو تقویت بخشی گئی۔

3.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- سرسید کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ وہ بیک وقت ادیب بھی تھے اور مدبر بھی، ماہرِ سیاست بھی تھے اور مفکر تعلیم بھی، مفسر بھی تھے اور بے بدل صحافی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تدبر سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی حالت کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔
- سرسید نے مدرسۃ العلوم، سرسید تحریک، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، سائنٹفک سوسائٹی اور رسائل وجرائد کے ذریعے ملک وقوم اور اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔
- سرسید نے نثر اور شاعری دونوں میں اصلاحات کیں۔ انھوں نے اپنے نظریات وخیالات سے شعر و ادب کی تمام جہتوں اور پہلوؤں کو متاثر کیا اور ادب کو نو آبادیاتی تناظر میں دیکھنے اور جانچنے پر زور دیا۔
- سرسید نے شعر و ادب کو اجتماعیت سے روشناس کرایا اور اس میں مقصدیت اور افادیت کو ترجیح دی۔ انہوں نے سادہ اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی۔
- سرسید سے قبل نثر زیادہ قابل توجہ نہیں تھی بلکہ شاعری پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی مگر وہ بھی افادیت اور مقصدیت سے عاری تھی۔ سرسید نے اردو نثر میں بہترین عملی نمونے پیش کیے نیز شاعری اور افسانوی ادب کو اپنے نظریات سے متاثر کیا اور تخلیقی مذاق نہ ہونے کی وجہ سے عملاً گریز کیا۔
- وہ ادب اور شاعری میں سادگی، افادیت، مقصدیت اور اصلاح کے قائل تھے۔ وہ اردو شعر و ادب کو مفید، کارآمد اور مفید بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب اور شاعری سے قوم کی اصلاح اور تربیت کا کام لیا جا سکتا ہے۔

- سر سید نے اردو صحافت کو صداقت، جانب داری، اور فرض شناسی کی اعلیٰ اقدار سے اس وقت روشناس کرایا جب وہ گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ انھوں نے اس اخبار کو صرف خبروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس اخبار کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کا بھی کام لیا، جس کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ انھوں نے اخبار کے ذریعے مغربی علوم وفنون اور ایجادات وانکشافات سے بھی عوام کو روشناس کرایا۔ انھوں نے خبروں کی زبان کو مقصدی بنا کر پیش کیا۔
- سید الاخبار، اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق نے جو نمایاں کارنامے انجام دیے اس عہد کے کسی دوسرے اخبار یا رسالے نے نہیں دیے۔
- سر سید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے صحافت نگاری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس رسالے کو سر سید نے 1870 میں شائع کیا۔ اس کے ذریعے سر سید نے نہ صرف اردو میں صحافتی زبان کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا بلکہ اس وقت کی جدید ترین صحافتی زبان کے ہم رتبہ کر دیا۔

3.5 کلیدی الفاظ

لفظ	:	معنی
تنوع	:	قسم قسم کا، رنگ برنگ کا ہونا، بوقلمونی
تقلید	:	پیروی، نقل، کسی کے قدم بہ قدم چلنا
گریز	:	بھاگنا، فرار، پرہیز، اجتناب، دوری
ناگزیر	:	چاروناچار، ضروری، جس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو،
تقاریظ	:	تقریظ کی جمع، مصنف کے علاوہ کسی اور کی کتاب یا مضمون پر اپنی رائے ظاہر کرنا
دیباچہ	:	وہ تحریر جس کسی کتاب کے شروع میں ہو، کسی چیز کا پہلا اور لازمی جزو، پیش خیمہ
تدوین	:	جمع وترتیب، تالیف، ترتیب دینے یا مرتب کرنے کا عمل
انشاپردازی	:	عبارت نویسی، مضمون نگاری، عبارت آرائی، مضمون لکھنے کا طریقہ
کوشاں	:	کوشش کرنے والا، سعی کرنے والا، تگ ودو کرنے والا
افادی	:	نفع بخش، فائدہ مند
تمثیلی	:	ایسی کہانی جس میں خیال وفکری اشیا کو مشخص کرکے پیش کیا جائے
متحرک	:	حرکت دیا جانا، چلتا پھرتا، حرکت کرنے والا
کینوس	:	وہ ٹاٹ جس سے بادبان اور خیمے تیار کیے جاتے ہیں اور جس پر تصویر بنائی جاسکتی ہے
تعطل	:	کسی کام کا بند ہو جانا یا رک جانا، بیکار ہونا

تتبع	:	پیروی، تقلید، نقل، پیچھے آنا
دور اندیشی	:	عقل مندی، ہوشیاری، انجام پر نظر رکھنا
نصیب العین	:	پیش نظر، مقصد، اصلی منشا
دستور العمل	:	اصول، ضابطہ، طریقہ کار، قانون
مقفیٰ مسجع	:	ایسی عبارت جس کے جملے ہم قافیہ یا ہم وزن ہوں

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1- سرسید کا اصل نام کیا تھا؟

(a) سرسید (b) احمد خان متقی بن محمد متقی (c) سید احمد (d) سید محمد

2- اصول تفسیر کے حوالے سے سرسید نے کون سی کتاب تصنیف کی؟

(a) تبئین القرآن (b) سیرت فریدیہ (c) تحریر فی اصول التفسیر (d) خطبات احمدیہ

3- سرسید کی مشہور کتاب "آثار الصنادید" کس سنہ میں لکھی گئی؟

1845(a) 1748(b) 1847(c) 1846(d)

4- "تبیین الکلام" کا موضوع کیا ہے؟

(a) ادبی (b) علمی (c) مذہبی (d) سیاسی

5- خطبات احمدیہ میں کل کتنے خطبات ہیں؟

10(a) 12(b) 11(c) 9(d)

6- جام جم کس نوعیت کی کتاب ہے؟

(a) تاریخی (b) ادبی (c) تحقیقی (d) مذہبی

7- اسباب بغاوت ہند میں بغاوت کے کتنے اسباب کا ذکر ہے؟

(a) چار (b) تین (c) دو (d) پانچ

8- سید الاخبار کے اولین ایڈیٹر کا نام بتایئے؟

(a) حالی (b) ذکاء اللہ (c) شبلی (d) مولوی عبد الغفور

9- "تہذیب الاخلاق" کتنی مرتبہ تعطل کا شکار ہوا؟

(a) دو مرتبہ (b) چار مرتبہ (c) تین مرتبہ (d) ایک مرتبہ

10- اسپیکٹر اور ٹیٹلر کہاں سے نکلتے تھے؟

(a)انگلستان (b)ہندوستان (c)مصر (d)ان میں سے کوئی نہیں

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1-"خطبات احمدیہ" کس کتاب کے جواب میں لکھی گئی؟

2-سرسید کے مذہبی نظریات کی وضاحت کیجیے۔

3-"اسباب بغاوت ہند" لکھنے کے پس پشت سرسید کے کیا مقاصد تھے؟

4-تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں کے نام بتایئے؟

5-سرسید کی صحافتی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1-خطبات احمدیہ کی روشنی میں سرسید کے مذہبی نظریات کی وضاحت کیجیے۔

2-سیرت کے حوالے سے سرسید کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3-"تہذیب الاخلاق" کے حوالے سے سرسید کی صحافتی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔

3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1-	مقالات سرسید	اسماعیل پانی پتی (مرتبہ)
2-	انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی (مرتبہ)
3-	سرسید کی صحافت	اصغر عباس
4-	سرسید اور علی گڑھ تحریک	خلیق احمد نظامی
5-	سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے	خلیق احمد نظامی
6-	اردو نثر کی تاریخ میں سرسید کا مقام	سید سلطان محمد حسین
7-	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی
8-	سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ	قدسیہ خاتون

3.6.1 کے جوابات

b-1	c-2	c-3	c-4	b-5
c-6	d-7	d-8	c-9	a-10

اکائی4 : علی گڑھ تحریک

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 علی گڑھ تحریک

4.2.1 علی گڑھ تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر

4.2.2 سر سید تحریک

4.2.3 علی گڑھ تحریک سے وابستہ اہم شخصیات

4.2.4 علی گڑھ تحریک کے اہم مقاصد

4.2.5 علی گڑھ تحریک کے اثرات اردو ادب پر

4.3 اکتسابی نتائج

4.4 کلیدی الفاظ

4.5 نمونہ امتحانی سوالات

4.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

1857 کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزی حکومت نے جس طرح ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں پر ظلم کی تمام حدیں پار کردی تھیں اور مسلمانوں کی سماجی صورت حال قابل رحم ہو چکی تھی۔ نئی تعلیم اور ترقی کے جدید تقاضوں سے بڑھتی ان کی دوری کی بنا پر شدید ترین مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں سر سید نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جدید تعلیم اور سائنسی علوم سے

ہمکنار کرنے کی کوشش کی اور ایک تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کو علی گڑھ تحریک اور سر سید تحریک کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس تحریک کے ذریعے سر سید نے ہندوستانیوں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور ادبی اصلاح کر کے انہیں وقت کے تقاضوں سے آشنا کیا، وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ایسے وقت میں جب مسلمان مشق ستم بنے ہوئے تھے، ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، تخریب نے پرچم بلند کر رکھا تھا اور مایوسی اپنی انتہا پر تھی تو سر سید نے تعمیر نو کے نہ صرف خواب دیکھے بلکہ انہیں شرمندۂ تعبیر بھی کیا۔

زیر نظر اکائی میں علی گڑھ تحریک، 1857 کی بغاوت، سر سید کے نظریات اور ان کی خدمات، علی گڑھ تحریک کے زیر اثر عمل میں آنے والی مسلمانوں کی سماجی اصلاح اور تعلیم و تربیت کی کوششوں کا مطالعہ کریں گے۔ سر سید کی خدمات اور علی گڑھ تحریک کا جائزہ لیں گے۔ اس اکائی میں اکتسابی نتائج کے ساتھ مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں نمونے کے طور پر امتحانی سوالات بھی دئے گئے ہیں، جن میں معروضی جوابات کے حامل سوالات، مختصر جوابات کے حامل اور طویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔ اکائی کے آخر میں کچھ کتابوں کے نام مع مصنف درج کیے گئے ہیں، جن کے مطالعے سے علی گڑھ تحریک، سر سید، ان کے رفقا اور ان کی خدمات سے متعلق آپ کو مزید معلومات فراہم ہوں گی۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- علی گڑھ تحریک کے مقاصد سے واقف ہو سکیں۔
- سر سید کے نظریات اور خدمات سے واقف ہو سکیں۔
- 1857 کے انقلاب اور بغاوت کے بارے میں جان سکیں۔
- انیسویں صدی کی سیاسی اور سماجی صورت حال سے واقف ہو سکیں۔
- انیسویں صدی میں مسلمانوں کی معاشرتی پستی اور تعلیمی بدحالی سے واقف ہو سکیں۔

4.2 علی گڑھ تحریک

4.2.1 علی گڑھ تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر

علی گڑھ تحریک کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس دور کے سماجی اور سیاسی پہلوؤں کو سمجھنا اور ان پر غور کرنا ضروری ہے جن کے رد عمل میں اس تحریک کا آغاز ہوا۔ 1857 کی تحریک آزادی اور اس کی ناکامی نے ہندوستانی معاشرے کو پوری طرح تباہ کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں پر ظلم اور جبر کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ اس عہد کے چند دانشوروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ ناکامی اور شکست محض دو طاقتوں اور سیاسی اقتدار کی جنگ نہیں ہے بلکہ دو تہذیبوں کی جنگ ہے، جس میں ایک تہذیب روایت کی بیڑیوں سے بندھی ہوئی زوال آمادہ تہذیب ہے جبکہ دوسری طرف جدید تقاضوں اور سائنسی علوم سے آراستہ تہذیب ہے اور مستقبل اسی جدید اور سائنسی تہذیب کا

ہے۔نئے حالات نے پرانے اور مروجہ نظام تعلیم کے کھوکھلے پن اور بے بسی کو واضح کر دیا تھا۔چند اصحاب نظر نے سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا کہ برصغیر کی عوام کی فلاح اور ترقی اسی میں ہے کہ وہ تعلیم اور ترقی کا ایسا راستہ اختیار کریں جو جدید اور سائنسی ہو۔ان کی دور رس نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مستقبل میں ترقی کے پیمانے کیا ہوں گے۔1857 کے بعد کے ہندوستان کا سماجی شیرازہ ہر اعتبار سے بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔غلامی کے اس عہد میں مایوسی اور ظلم اپنی انتہا پر ہے۔ایسے میں چند مصلح، معمار، معلم، رہنما اور دانشور ایسے ظاہر ہوتے ہیں جو اس راکھ سے کچھ ٹمٹماتے ہوئے انگارے جمع کر کے سماج کو نئی روشنی سے منور کرنے کا خواب بنتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں میں سرسید کا نام سب سے نمایاں ہے۔

1857 میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک بغاوت شروع ہوئی جس کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔اس بغاوت کی سربراہی مختلف علاقوں میں مختلف علما، سیاسی رہنما، شاہی خاندان کر رہے تھے لیکن اس کی مرکزی قیادت آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہاتھوں میں تھی۔اس جدوجہد کے نتیجے میں دہلی، لکھنؤ جیسے بڑے شہروں کو انگریزی حکومت سے آزاد کرالیا گیا۔انگریزوں نے ستمبر 1857 کو دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا اور ظلم و بربریت کا ایسا وحشت ناک کھیل کھیلا جس کی مثال تاریخ میں کم ہی نظر آتی ہے۔لاکھوں لوگوں کو قتل کر دیا گیا، مال و دولت لوٹ لیا گیا اور گھر نذر آتش کر دیے گئے۔ویسے تو تمام ہندوستانی ہی مظلوم تھے لیکن مسلمانوں پر ظلم کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔اس کی وجہ یہ تھی اس بغاوت کے براہ راست ذمہ دار مسلمان ٹھہرائے گئے۔انگریزی حکومت کا ماننا تھا انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے وہ براہ راست ان کے دشمن تھے۔اس کے علاوہ ان کے نزدیک اس بغاوت کو بھڑکانے اور اس کی قیادت کرنے والے مسلمان تھے۔ان وجوہات کی بنا پر اس بغاوت کے اصل ذمہ دار مسلمان ٹھہرائے گئے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں پر ظلم کی نئی داستانیں رقم ہوئیں۔انگریزوں کی قتل و غارت گری سے جو لوگ دہلی سے جان بچا کر بھاگ گئے تھے جب وہ واپس لوٹے تو ان لوگوں پر ایک خاص جرمانہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔اس جرمانے کی ادائگی میں بھی یہ فرق روا رکھا گیا کہ مسلمانوں سے ان کی ملکیت کا پچاس فی صد اور ہندوؤں سے دس فی صد جرمانہ عائد کیا گیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1857 کے بعد مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی صورت حال کس قدر قابل رحم اور افسوسناک ہو چکی تھی۔ایسے عالم میں چند رہنماؤں نے یہ محسوس کیا اور اس بات پر غور کیا کہ مسلمانوں کو اس تباہی اور پستی سے کیسے باہر نکالا جائے۔ان رہنماؤں میں سرسید کا نام سب سے واضح اور نمایاں ہے۔سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو روایت کی بیڑیوں سے آزاد کر کے ان کو جدید تعلیم سے جوڑنا، ان کے اندر سائنسی رجحان کو بیدار کرنا ضروری ہے کیونکہ یہی وقت کا تقاضہ ہے۔ساتھ ہی انہوں نے انگریزی حکمرانوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کو ظلم سے نجات ملے۔لیکن یہ کام بے حد مشکل تھا کیونکہ مسلمان انگریزی حکومت، ان کے جدید تعلیمی نظام سے شدید نفرت کرتا ہے۔سرسید نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا اور اپنے مقاصد کی تکمیل میں لگ گئے۔انگریزی حکومت اور مسلمانوں کی مصالحت کے لیے سرسید نے "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" اور "اسباب بغاوت ہند" کے عنوان سے کتابیں لکھیں اور بغاوت کے لیے انگریزی حکومت کی غلط حکمت عملی اور ظلم و جبر کو ذمہ دار ٹھہرایا۔انہوں نے "اسباب بغاوت ہند" میں لکھا کہ بغاوت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ رعایا میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ حکومت سارے

ہندوستانیوں کو عیسائی بنا دے گی اور ان پر بدیسی رسم و رواج تھوپ دے گی۔ ان دعووں کو انگریزی حکومت کے مذہبی معاملات میں مداخلت، تبدیلیِ مذہب کے بڑھتے معاملات کی وجہ سے ان دعووں کو تقویت بھی مل رہی تھی۔

4.2.2 سرسید تحریک

انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید احمد خان کی قیادت میں مسلمانوں کی سماجی اصلاح، سیاسی بیداری اور انہیں جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا جس کا بنیادی مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی اصلاح تھا۔ سرسید نے اس بات پر غور کیا کہ قوم کو اس پستی اور بدحالی سے کیسے نکالا جائے۔ غور و فکر کے بعد انہیں یہی جواب ملا کہ تعلیم و تربیت واحد راستہ ہے جس کے ذریعے قوم کی بدحالی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ سرسید کے نزدیک مسلم معاشرے کی پستی اور بدحالی کی سب سے اہم وجہ تھی اس کا وقت کی رفتار اور تقاضوں کے ساتھ نہ چلنا دنیوی رسم و رواج کو دینی مسائل میں شامل کر لینا۔ سرسید کے نزدیک اس کلیے کا اطلاق ان تمام قوموں پر ہوتا ہے جو ایک زمانے میں عروج پر تھیں اور پھر زوال آمادہ ہو گئیں۔

سرسید نے اپنی دور اندیشی اور مصلحت شناسی سے مستقبل کے امکانات اور ترقی کے تصور کو دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی بصیرت اور دور بین نگاہوں سے آنے والے وقت میں قائم ہونے والے تعلیم اور تہذیب کے معیار کو سمجھ کر اس کی ضرورت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی طرح دم توڑتی قدروں پر بے فائدہ اصرار کرنے اور ان پر نوحہ کرنے کے بجائے نئے معیار تعلیم و تہذیب کے مطابق ہندوستانی سماج کو ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی، جس میں ترقی اور ارتقا کے وسیع امکانات پوشیدہ تھے۔ آل احمد سرور اپنے مضمون "سرسید اور مغرب کے تہذیبی اور ادبی اثرات" میں لکھتے ہیں:

> "سرسید کی دور بین نگاہوں نے اس وقت یہ سارے امکانات دیکھ لیے تھے جب ان کے ہم عصر اپنی محدود بصیرت کی وجہ سے صرف اپنی بربادی کے ماتم میں مصروف تھے اور اپنی جذباتیت کی وجہ سے ہر تازہ لہر کو ایک خطرہ اور ہر نئی بات کو ایک فتنہ سمجھ رہے تھے۔"
>
> (علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر، ص39، مرتبہ نسیم قریشی55-1954)

انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور سماجی اصلاح کو اپنا مقصد بنالیا اور پوری طرح اس مقصد کی تکمیل کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ خوف و دہشت اور تاریکی و جہالت کے اندھیروں کے بیچ نفرت اور بے حسی کے طوفانوں کی زد میں سرسید امید کی شمع لے کر نکلے اور روشنی کے بلند مینار تعمیر کرتے چلے گئے۔ سرسید دہلی سے نکلے اور ہندوستان کے دیگر شہروں میں علم کی روشنی بانٹتے ہوئے علی گڑھ پہنچے اور اس شہر کو انہوں نے قوم کی تربیت گاہ کے لیے منتخب کر لیا۔ 1864 میں سرسید نے ایک سوسائٹی "سائینٹفک سوسائیٹی" کے نام سے غازی پور میں قائم کی۔ جس کا مقصد مسلمانوں میں سائینسی علوم اور تکنیکی علوم کو فروغ دینا، تاریخ سے روشناس کرانا اور مغربی ادب کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ بعد میں 1966 میں یہ سوسائیٹی سرسید کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئ۔ سرسید نے علی گڑھ میں "مدرسۃ العلوم" کے نام سے ایک جدید مدرسہ قائم کیا اور بعد میں اس کی توسیع سر سرسید کے

ذریعے "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کے نام سے ہوئی۔ 8 جنوری 1877 میں برطانوی وائسرائے لارڈ لٹن نے سرسید کی موجودگی میں باقاعدہ کالج کا افتتاح کیا۔ اس ادارے کا مقصد مسلمانوں کو جدید سائینسی علوم اور مغربی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ یہی ادارہ 1920 میں ایک ایکٹ کے تحت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

سرسید نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی غرض سے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ سرسید جب انگلستان میں تھے تو انہیں اردو اور انگریزی میں رسالہ جاری کرنے کا خیال آیا۔ اردو میں تہذیب الاخلاق اور انگریزی میں "سوشل رفارمر" کے عنوان سے دو رسالے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ تقریباڈیڑھ برس انگلستان میں گزار کر 1870 میں جب ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے 24 دسمبر 1870 کو تہذیب الاخلاق کیا۔ اس رسالے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

> "اس پرچے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قومیں کہلائیں۔"
>
> (مقالات سرسید، جلد 10 ، ص 35، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، 1966)

اس کے بعد سویلائزیشن (تہذیب) کے مطلب کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سویلائزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے تہذیب کیا ہے۔ مگر اس کے معنیٰ نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون وہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جیسے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکن اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"
>
> (مقالات سرسید، جلد 10 ، ص 35، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، 1966)

سرسید نے قوم کی ترقی کا خواب دیکھا اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ سرسید نے اپنے نظریات سے اس عہد کے دانشوروں کو متاثر کیا اور اپنی دانشمندی اور اعلیٰ ظرفی سے سب کو جوڑ کر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لیے۔

علی گڑھ تحریک کو ایسی تحریک کے طور پر جانا جاتا ہے جو بہت کم وقت میں اپنے مقاصد کو بڑی حد تک حاصل کر لیا۔ سرسید نے جدید تعلیم کے فروغ اور سماجی اصلاح کے لیے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر واضح طور پر ان کی زندگی میں ہی ظاہر ہونے لگی تھی۔ جس کو ہندوستان کی تاریخ میں اپنے غیر معمولی کارناموں اور دور رس نظریات کے زیر اثر سماجی، سیاسی اور سب سے بڑھ کر تعلیمی و ادبی خدمات انجام دینے کی بنا پر غیر معمولی اہمیت اور مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس تحریک کے ذریعے ہندوستانیوں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور ادبی اصلاح کر کے انہیں وقت کے تقاضوں سے آشنا کیا، وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور حسب حال ڈھالنے کی کوشش کی۔ ایسے وقت میں جب مسلمان مشق ستم بنے ہوئے تھے، ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، تخریب نے پرچم بلند کر رکھا تھا اور

مایوسی اپنی انتہا پر تھی تو سر سید نے تعمیر نو کے نہ صرف خواب دیکھے بلکہ انہیں شرمندۂ تعبیر بھی کیا۔ سر سید نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں، اپنے بے انتہا خلوص، بے حد مضبوط عزم اور رواداری سے لبریز جذبے کی بنیاد پر اعلیٰ ترین کارنامے اور خدمات انجام دیں۔ ان کی خدمات کے دوررس اور نتیجہ خیز اثرات نے نئے ہندوستان کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے جو وقت کے ساتھ اور واضح ہوتے جارہے ہیں اور ان کی افادیت سے عام طور پر پورا ہندوستان اور بالخصوص مسلمان بہرہ ور ہوتے رہے ہیں۔ سید احمد خاں نے جدید ہندوستان کی نئی تعلیمی، سماجی اور تہذیبی بنیادوں اور ان بنیادوں پر نو آبادیاتی نظام کے متقاضی سماج کی تعمیر نو اور تشکیل نو میں ایک عظیم معمار کی حیثیت سے جو کردار ادا کیا ہے ہندوستان میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ سر سید نے اپنے نظریات اور افکار سے اپنے پورے عہد کو متاثر کیا ہے۔ اس عہد کی تشکیل نو میں سر سید کے نظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سر سید ایک معیار کے طور پر ابھرتے ہیں اور سماج کے دھارے کو نئی سمت میں موڑ دیتے ہیں جو اسے وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

4.2.3 علی گڑھ تحریک سے وابستہ اہم شخصیات

الطاف حسین حالی:

الطاف حسین حالی سر سید کے اہم رفیق اور علی گڑھ تحریک کے اہم رکن تھے جنہوں نے شعر و ادب میں سر سید کے نظریات کی پیروی کی۔ اردو شاعری کے اصول وضع کیے اور جدید نظم کی بنیاد ڈالی۔ حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر باقاعدہ اردو ادب میں تنقید کی بنیاد ڈالی۔ ان کی مسدس "مد و جزر اسلام" علی گڑھ تحریک کا منشور تسلیم کی جاتی ہے۔ حالی نے سر سید کی سوانح "حیات جاوید" کے نام سے لکھی ہے۔ حالی نے علی گڑھ تحریک کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

شبلی نعمانی:

شبلی نعمانی غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم، مورخ، فلسفی، سیرت نگار، عربی اور فارسی کے ماہر اور عمدہ شاعر تھے۔ انہوں نے سر سید کے دور میں علی گڑھ میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ شبلی نے بعد میں ندوۃ العلما لکھنؤ قائم کیا۔ شبلی نے "سیرۃ النبی" لکھ کر اردو میں سیرت نگاری کی بنیاڈ ڈالی۔ شبلی علی گڑھ تحریک کے اہم رکن مانے جاتے ہیں۔ وہ سر سید سے فکری اختلاف رکھنے کے باوجود ان سے وابستہ رہے اور علی گڑھ تحریک کی تعلیمی مقاصد میں معاون رہے۔

مولوی نذیر احمد:

مولوی نذیر احمد تحریک کے نمایاں رکن تھے۔ انہیں اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو کے ابتدائی ناول لکھے اور جدید اردو نثر کی بنیاد رکھی۔ ادب میں یہ وہی تبدیلی تھی جو سر سید دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ناولوں کا بنیادی مقصد معاشرتی اصلاح، اخلاقی قدروں کا فروغ اور نئی نسل کی کردار سازی اور تربیت تھا۔ نذیر احمد کا پہلا ناول "مرآۃ العروس" تھا۔ نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر زور دینے کی کوشش کی۔

نواب محسن الملک:

محسن الملک کا اصل نام سید مہدی علی تھا۔ وہ سر سید کے اہم ساتھی اور ان کے بڑے معتمد تھے۔ سر سید کے انتقال کے بعد انہوں نے علی گڑھ تحریک کی باگ ڈور سنبھالی۔ محسن الملک نے اردو زبان کی مدافعت کے لیے بہت کوششیں کیں۔ 1901 میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی جس کے تحت ملک بھر میں اردو کی حمایت میں مختلف مقامات پر جلسے کیے گئے اور انگریزی حکومت کے خلاف سخت غصے کا اظہار کیا گیا۔ علی گڑھ تحریک اور کالج کے معاشی مسائل انہیں کی کوششوں سے بہتر ہوئے۔

نواب وقار الملک:

وقار الملک کا اصل نام مشتاق حسین زبیری تھا۔ وہ علی گڑھ تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ وہ 1866 میں سائنٹفک سوسائیٹی کے ممبر بنے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مغربی تجربات سے استفادے کے لیے "انقلاب فرانس اور نپولین" کا فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے سر سید کے مقاصد کے لیے دن رات محنت کرتے تھے اور انہوں نے خود کو پوری طرح تحریک کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وقار الملک نے ایم اے او کالج کے لیے چندہ جمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس وقت ساڑھے سات لاکھ کی خطیر رقم اکٹھا کر کے جمع کرائی۔

مولوی چراغ علی:

مولوی چراغ علی سر سید کے خاص رفقا میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی جدید اور عقلی توجیہات پیش کیں اور سائینٹفک سوسائیٹی کے ساتھ کام کیا۔ وہ علی گڑھ میں مقیم نہیں رہے اور سرکاری ملازمتوں میں مصروف رہے۔ اس کے باوجود انہوں نے علی گڑھ تحریک کا بھرپور علمی اور مالی تعاون کیا۔ تحریک سے ان کو گہری فکری اور قلبی وابستگی تھی۔ ایم اے او کالج کی تاسیس اور قیام میں انہوں نے بہت دلچسپی دکھائی، تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین لکھے اور علی گڑھ تحریک کی تائید اور ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

ذکاء اللہ:

ذکاء اللہ دہلوی علی گڑھ تحریک کے اہم رکن تھے۔ انہوں نے تاریخ اور سائینسی موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ وہ سائنٹفک سوسائیٹی کے ابتدائی ممبر تھے۔ اسٹیٹیوٹ گزٹ میں ان کے تبصرے اور مضمون شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی اور پھر وہیں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مدرسۃ العلوم کی ترقی کے خواہاں تھے اور اس کے قیام کے لیے انہوں نے سر سید کو بھرپور تعاون کیا۔ وہ کہتے تھے کہ میری ساری امیدیں اس کالج سے وابستہ ہیں۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو میری زندگی کا کام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ وہ کالج کی ترقی اور تمام معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

مولوی سمیع اللہ خان:

مولوی سمیع اللہ خان علی گڑھ تحریک کے ابتدائی دور کے رہنما اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر تھے۔ سر سید کے اولین رفقا میں تھے۔ وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام میں سر سید کے معاون اور شریک کار رہے۔ وہ کالج کے فنڈ جمع کرنے اور تعمیراتی امور کی

نگرانی کرنے والی کمیٹی کے سکریٹری بھی تھے۔ مولوی سمیع اللہ پیشے سے جج تھے۔ 1856 میں دہلی مین قانون کا پاس کرنے والے پہلے امیدواروں میں شامل تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا۔

4.2.4 علی گڑھ تحریک کے اہم مقاصد

علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کے رجحان کو فروغ دینا اور ان کی سماجی اصلاح کرنا تھا۔ جدید تعلیم اور سائینسی علوم کے فروغ کے لیے سر سید نے تعلیمی ادارے قائم کیے، سائینٹفک سوسائیٹی قائم کی۔ اس کے بعد اس تحریک کے زیر اثر ہندوستان میں جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کا سلسلہ چل نکلا۔ مسلمانوں کی تربیت کے لیے انہوں نے رسالے نکالے اور ان میں اصلاحی مضامین تحریر کیے۔ سر سید احمد خاں نے اگرچہ تعلیم کے فروغ میں اور مسلمانوں کی سماجی و معاشرتی اصلاح کے لیے عملی کارنامے انجام دیے ہیں اور ان کی تحریک کا مطمح نظر جدید تعلیم بالخصوص مغربی طرز تعلیم کا فروغ تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے عہد میں مختلف شعبہ ہائے حیات اور سماج کے مختلف پہلوؤں پر بھی اپنے دور رس اثرات ثبت کیے ہیں۔ سر سید نے سماجی اصلاح پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ انہوں نے سکھایا کہ نو آبادیاتی نظام حکومت میں کس طرح ترقی کی راہیں استوار کی جاسکتی ہیں اور کس حکمت عملی پر گامزن ہو کر نئے خوابوں کی تعمیر کر کے انہیں تعبیر سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے جہاں سماجی اصلاح پر خاص توجہ دی ہے اور تعلیم کے میدان میں گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں وہیں اردو شعر وادب کا احیاء نو ان کے نظریات کے زیر اثر عمل میں آیا ہے۔ ہندوستانی سماج کی ترقی، جدید سائنسی علوم کے مشرق میں احیانو، زبان و ادب کو محدود طرز اظہار اور مخصوص سانچے سے نکال کر اس کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کرنے میں علی گڑھ تحریک کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف سے انحراف ممکن نہیں ہے۔

سر سید کے نظریات سے تحریک حاصل کر کے اس تحریک سے وابستہ دانشوروں اور عالموں نے تقریباسماج اور معاشرے کے ہر شعبے کو متاثر کیااور اس کو اصلاح کے دائرے میں لے لیا۔ یہاں وہ خاص نکات درج ہیں جن کی اصلاح پر سر سید نے توجہ مبذول کرائی:

- تعلیم کے ساتھ تربیت پر زور دینا
- دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم حاصل کرنا۔
- سائینسی علوم پر خصوصی توجہ دینا
- مغربی تعلیم سے استفادہ
- مذہبی توہمات کا اخراج
- روایت پرستی ترک کے ایجاد اور جدت کی طرف میلان
- خاندانی اور سماجی رسوم
- اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی بازیابی
- قومی جذبہ پیدا کرنا
- شادی بیاہ میں فضول خرچی سے بچنا
- تجارت و زراعت میں جدید تکنیک اور نئے ذرائع پیداوار پر زور
- جدید ٹکنالاجی سیکھنے اور اپنانے کی ترغیب

4.2.5 علی گڑھ تحریک کے اثرات اردو ادب پر

علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے جوڑ کر ان کی سماجی حیثیت کو بہتر کرنا تھا۔ لیکن سر سید کے

نظریات اور علی گڑھ تحریک کے اثرات اس قدر دور رس اور ہمہ گیر تھے کہ انسانی زندگی اور تعلیم و تہذیب کے تمام شعبے ان سے متاثر ہوئے۔ علی گڑھ تحریک اگرچہ ادبی تحریک نہیں تھی لیکن زبان وادب کی اصلاح اور ترقی میں اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر ادب کی تشکیل جدید عمل میں آئی۔ افسانوی نثر ہو یا غیر افسانوی نثر، شاعری ہو یا ادبی تنقید کے نئے مباحث، ہر طرف سرسید کے نظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سرسید نے اردو میں سادہ اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی، شاعری میں اپنے نظریات سے حالی اور آزاد کو متاثر کیا جس کی بنا پر نیچرل شاعری اور نظم جدید کے تصور کا عملی اظہار ہوا۔ افسانوی ادب مغربی طرز اختیار کر گیا اور باقاعدہ ناول اور افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ زبان وادب کی نئی تشکیل اور اس کے وسیع امکانات کی دریافت سرسید نے کی اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اس کی ترویج و توسیع عمل میں آئی۔ سرسید نے اردو نثر میں عمدہ عملی نمونے پیش کیے ہیں اور اپنے مضامین کے ذریعہ علمی اور سادہ نثر کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی۔

علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ ادب کی مختلف جہات اور اصناف میں غیر معمولی تبدیلی اور ترقی رونما ہوئی۔ شاعری میں بڑا انقلاب براہ راست حالی اور آزاد کے ذریعہ نظم جدید کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور نیچرل شاعری کی ترویج اس تحریک کے اہم ترین مقاصد میں شامل ہو گئی۔ حالی اور آزاد کی یہ کوشش سرسید کے نظریات کی عملی تصویر تھی۔ سرسید نے طرز تعلیم، انگریزی زبان وادب اور تہذیب سے بھرپور استفادہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ وہ روایت پرستی اور قدامت پسندی کے طلسم کو توڑ کر عقلیت پسندی، فطرت پسندی اور ادب میں سادگی و مقصدیت کے رجحان کو عام کرنے اور اس جدید تصور ادب کو فروغ دینے میں کوشاں رہے جس کی وجہ سے سرسید اردو زبان و ادب میں واقع ہونے والے اثرات اور غیر معمولی تبدیلی کے سب سے بڑے محرک ثابت ہوئے۔

سرسید شاعری میں افادیت کے قائل تھے اور ادب میں بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری کو رواج دے کر اسے مفید اور کار آمد بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب سے قوم کی اصلاح، اخلاقی اور تہذیبی تربیت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ سرسید نے مغربی ادب پاروں اور فن پاروں کو دیکھا تو ان میں وہ خوبیاں نظر آئیں جن کا تقاضا ان کی اصلاح پسند فکر کر رہی تھی اور انگریزی شعر و ادب کو انہوں نے نمونۂ عمل قرار دے دیا۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے ساتھ اس کے مضامین میں شعر وادب کے بارے میں بھی اظہار خیال کرنا شروع کیا اور نثر میں بذات خود سادہ طرز اظہار اور اسلوب بیان اختیار کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعری میں بھی نئے مضامین اور جدید طرز اظہار پر شدید اصرار کیا۔ 1868 میں انجمن پنجاب کے جلسے میں کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد نے شاعری میں نئے خیالات اور نظم جدید کی صورت میں نیچرل طرز اظہار کا عملی نمونہ پیش کیا اور 1874 میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام لاہور میں نظم پر مبنی مشاعروں کا جب باقاعدہ آغاز ہوا جس میں بعد میں حالی بھی شریک ہوئے، تو سرسید کو اس میں اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر اور اپنے نظریات ادب کی تصویر نظر آئی اور انہوں نے واضح اور کھلے لفظوں میں جدید نظم کی اس تحریک کی حمایت کی۔ سرسید عشق و عاشقی پر مبنی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس طرح کی شاعری ان کے نزدیک وقت گزاری اور لطف اندوزی کا ذریعہ تو ہو سکتی مگر لوگوں کے کام نہیں آسکتی تھی۔ وہ اس طرح کی شاعری کو مخرب اخلاق تصور کرتے تھے۔ وہ مبالغہ، تشبیہ، استعارہ اور بیان کے پیچیدہ طرز اظہار کو بھی بے جا خیال کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:

"فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب و ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص ہو گیا ہے، تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر جذبے میں جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور جبلی حالت کا کسی پیرایہ یا کنایہ، اشارہ یا تشبیہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ اثر کرتا ہے۔" (تہذیب الاخلاق، مارچ 1872)

حالی اور آزاد کے ذریعہ جب باقاعدہ نظم جدید کی بنیاد پڑی تو سرسید نے بڑی وضاحت اور اظہار مسرت کے ساتھ اس کی حمایت کا اعلان کیا۔ سرسید کے نظریات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم جدید کی شکل میں جو نیچرل شاعری وجود میں آرہی تھی، سرسید انگریزی کے تتبع میں ایسی ہی شاعری کا خواب دیکھ چکے تھے اور اس کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے۔ سرسید نے انجمن پنجاب کے مناظموں اور ان میں پیش کی جانے والی نیچرل نظموں کی حمایت میں تہذیب الاخلاق میں لکھا اور حالی اور آزاد کو خطوط لکھ کر بھی بھرپور تائید کی اور اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا۔ سرسید اپنے مضمون "علم انشا اور اردو نظم" میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں 1874 کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ ہوا، ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان (آزاد) کی مثنوی "خواب امن" ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی "حب وطن" اور مثنوی "مناظرۂ رحم وانصاف" در حقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگیٔ الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔" (مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص555)

سرسید نے آزاد اور حالی کی خوب حوصلہ افزائی کی اور ان کی نیچرل شاعری اور نظموں کی اس پہل پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دیرینہ تمنا کے پورے ہونے سے تعبیر کیا۔ سرسید نے حالی اور آزاد کو لکھے اپنے متعدد خطوط میں ان کی نیچرل نظموں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں مبارکباد دی۔ سرسید ان خطوط میں ان نظموں پر تبصرہ بھی کرتے ہیں اور اصلاح کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اپنے ادبی و شعری نقطۂ نظر کے اعتبار سے آزاد کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور مکمل نیچرل طرز اختیار کرنے اور انگریزی شاعری سے خیال اخذ کرنے پر اصرار کیا ہے۔

سرسید نے نظم جدید کی تحریک پر جس طرح کا ردعمل ظاہر کیا تھا وہ نظریاتی سطح پر نیا نہیں تھا کیونکہ سرسید شاعری میں ایسی ہی کسی اصلاح کا تصور رکھتے تھے۔ انگریزی زبان وادب کو نمونۂ عمل بنانے پر ان کے مضامین اور تقاریر میں بہت زور اور اصرار پہلے کیا جا چکا تھا۔ حالی اور آزاد کے ذریعہ نیچرل شاعری کی صورت میں سرسید کے نظریات کی عملی توسیع عمل میں آرہی تھی۔ سید عبداللہ حالی کے نظریات شعر وادب پر مبنی اردو کی پہلی باقاعدہ تنقید "مقدمۂ شعر و شاعری" کو سرسید کے نظریات اور خیالات کی صدائے بازگشت قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مولانا حالی کا مقدمہ شعر وشاعری تقریبا انہی خیالات کی زیادہ منظم اور مربوط تفسیر ہے۔ طرز ادا میں سادگی کی اہمیت، بے تکلفی اور مدعا نگاری کی ضرورت، شاعری کا اجتماع کے لیے مفید ہونا اور اس کی افادی اور تعمیری صلاحیت، یہ سب سرسید کے ارشادات کی صدائے بازگشت ہے۔"

(سرسید کا اثر ادبیات اردو پر، علی گڑھ نمبر، علی گڑھ میگزین، ص72 مرتبہ نسیم قریشی 55-1954)

سرسید نے جدید اردو شاعری کے ارتقا میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اردو شعر و ادب میں تبدیلی کی کوشش کی اور سرسید تحریک کے زیر اثر بہت مختصر مدت میں اردو شاعری اور ادب نے تبدیلی اور ترقی کی کئی مسافتیں ایک ساتھ طئے کر لیں۔ خواہ اردو نثر ہو یا نظم، افسانوی ادب ہو یا غیر افسانوی، ادب میں نظریاتی اصلاح ہو یا زبان و بیان کی اصلاح، ہر اعتبار سے ادب میں بے پناہ ترقی ہوئی اور اصلاح عمل میں آئی۔ اردو شاعری میں نیچرل طرز اظہار، حقیقت پسندی اور سادگی ان کی تحریک کے زیر اثر ہی عمل میں آئی تھی۔ سرسید نے اردو شاعری میں نظم کو رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اپنے عہد کے شعرا کو فطری اور حقیقت پسندانہ نظمیں لکھنے کی تلقین کی اور فرمائش کر کے نظمیں لکھوائیں۔ حالی نے اپنی شاہکار نظم "مسدس مدوجزر اسلام" سرسید کی فرمائش پر ہی لکھی تھی۔

سرسید نے علی گڑھ کالج کے اندر ادبی ماحول قائم کیا اور طلبہ میں ادب کا جدید رجحان عام کرنے کی کوشش کی۔ کالج میں سرسید ادبی جلسے اور مسابقے بڑے اہتمام سے کرواتے تھے تاکہ طلبہ میں ادبی ذوق بیدار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کا مقام ہمیشہ شعر و ادب میں ممتاز رہا اور ابتدا ہی سے یہاں سے بڑے اور اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر نکلے۔

4.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- 1857 کی تحریک آزادی اور اس کی ناکامی نے ہندوستانی معاشرے کو پوری طرح تباہ کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں پر ظلم اور جبر کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ اس عہد کے چند دانشوروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ ناکامی اور شکست محض دو طاقتوں اور سیاسی اقتدار کی جنگ نہیں ہے بلکہ دو تہذیبوں کی جنگ ہے، جس میں ایک تہذیب روایت کی بیڑیوں سے بندھی ہوئی زوال آمادہ تہذیب ہے جبکہ دوسری طرف جدید تقاضوں اور سائنسی علوم سے آراستہ تہذیب ہے اور مستقبل اسی جدید اور سائنسی تہذیب کا ہے۔ نئے حالات نے پرانے اور مروجہ نظام تعلیم کے کھوکھلے پن اور بے بسی کو واضح کر دیا تھا۔
- سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو روایت کی بیڑیوں سے آزاد کر کے ان کو جدید تعلیم سے جوڑنا، ان کے اندر سائنسی رجحان کو بیدار کرنا ضروری ہے کیوں کہ یہی وقت کا تقاضہ ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے انگریزی حکمرانوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کو ظلم سے نجات ملے۔ سرسید نے "تاریخ سرکشی بجنور" اور "اسباب بغاوت ہند" کے عنوان سے کتابیں لکھیں اور بغاوت کے لیے انگریزی حکومت کی غلط حکمت عملی اور ظلم و جبر کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

- 1864 میں سر سید نے ایک سوسائیٹی "سائینٹفک سوسائیٹی" کے نام سے غازی پور میں قایم کی۔ جس کا مقصد مسلمانوں میں سائینسی علوم، تکنیکی علوم اور کو فروغ دینا، تاریخ سے روشناس کرانا اور مغربی ادب کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ بعد میں 1966 میں یہ سوسائیٹی سر سید کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی۔
- سر سید نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی غرض سے تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا۔ سر سید جن انگلستان میں تھے تو انہیں اردو اور انگریزی میں رسالہ جاری کرنے کا خیال آیا۔ اردو میں تہذیب الاخلاق اور انگریزی میں سوشل رفارمر کے عنوان سے دو رسالے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ برس انگلستان میں گزار کر 1870 میں جب ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے 24 دسمبر 1870 کو تہذیب الاخلاق کا اجرا کر دیا۔
- علی گڑھ تحریک کا بنادی مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کے رجحان کو فروغ دینا اور ان کی سماجی اصلاح کرنا تھا۔ جدید تعلیم اور سائینسی علوم کے فروغ کے لیے سر سید نے تعلیمی ادارے قائم کیے، سائینٹفک سوسائیٹی قائم کی۔ اس کے بعد اس تحریک کے زیر اثر ہندوستان میں جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کا سلسلہ چل نکلا۔ مسلمانوں کی تربیت کے لیے انہوں نے رسالے نکالے اور ان میں اصلاحی مضامین تحریر کیے۔
- علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ ادب کی مختلف جہات اور اصناف میں غیر معمولی تبدیلی اور ترقی رونما ہوئی۔ شاعری میں بڑا انقلاب براہ راست حالی اور آزاد کے ذریعہ نظم جدید کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور نیچرل شاعری کی ترویج اس تحریک کے اہم ترین مقاصد میں شامل ہو گئی۔ حالی اور آزاد کی یہ کوشش سر سید کے نظریات کی عملی تصویر تھی۔ سر سید نے طرز تعلیم، انگریزی زبان وادب اور تہذیب سے بھرپور استفادہ کرنے کی تلقین کی ہے۔
- 1868 میں انجمن پنجاب کے جلسے میں کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد نے شاعری میں نئے خیالات اور نظم جدید کی صورت میں نیچرل طرز اظہار کا عملی نمونہ پیش کیا اور 1874 میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام لاہور میں نظم پر مبنی مشاعروں کا جب باقاعدہ آغاز ہوا جس میں بعد میں حالی بھی شریک ہوئے، تو سر سید کو اس میں اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر اور اپنے نظریات ادب کی تصویر نظر آئی اور انہوں نے واضح اور کھلے لفظوں میں جدید نظم کی اس تحریک کی حمایت کی۔

4.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی	الفاظ	:	معنی
تخریب	:	تباہی، خرابی، نقصان	مروجہ	:	رائج، جو رواج پا چکا ہو
مداخلت	:	دخل دینا، دخل اندازی	مصلح	:	اصلاح کرنے والا
معمار	:	تعمیر کرنے والا	تتبع	:	اتباع، پیروی، تلاش و جستجو
تعبیر	:	عبور کرنا، پار کرنا، پورا ہونا	مسافت	:	فاصلہ، دوری

منشور : اعلان نامہ، شاہی فرمان دیرینہ : پرانا، بہت قدیم

4.5 نمونہ امتحانی سوالات

4.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ سائنٹفک سوسائیٹی کب قائم ہوئی؟

1864(a) 1865(b) 1866(c) 1867 (d)

2۔ تہذیب الاخلاق کس سنہ میں جاری ہوا؟

1865(a) 1870(b) 1875(c) 1880 (d)

3۔ سرسید نے کس نام سے علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا تھا؟

(a)دار العلوم (b)مدرسۃ العلوم (c)مدرسہ علی گڑھ (d) علی گڑھ کالج

4۔ سائنٹفک سوسائیٹی کی بنیاد کہاں رکھی گئی؟

(a)بنارس (b)علی گڑھ (c)غازی پور (d) دہلی

5۔ سرسید کس سنہ میں انگلستان سے لوٹے؟

1855(a) 1861(b) 1870(c) 1878 (d)

6۔ 1857 کی بغاوت کے لیے انگریز کس کو ذمہ دار مانتے تھے؟

(a)ہندوؤں کو (b)سکھوں کو (c) مسلمانوں کو (d) ان میں سے کسی کو نہیں

7۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو کس سنہ میں یونیورسٹی کا درجہ ملا؟

1907(a) 1912(b) 1920(c) 1927 (d)

8۔ سیرت النبی کس کی تصنیف ہے؟

(a)شبلی (b)سرسید (c)حالی (d) محسن الملک

9۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر کون تھے؟

(a)سرسید (b)وقار الملک (c)شبلی (d) مولوی سمیع اللہ خان

10۔ کس تحریک کی ناکامی نے ہندوستانی معاشرے کو پوری طرح تباہ کر دیا تھا؟

(a)علی گڑھ تحریک (b)پہلی جنگ آزادی (c)سودیشی تحریک (d) عدم تعاون تحریک

4.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ جدید تعلیم سے متعلق سرسید کے نظریات کی وضاحت کیجیے۔

2۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصد واضح کیجیے۔

3۔ سرسید مسلم معاشرے میں کس طرح کی اصلاح چاہتے تھے، واضح کیجیے۔

4۔ سرسید ادب میں کیا اصلاح چاہتے تھے، واضح کیجیے۔

5۔ حالی اور آزاد نے اردو شاعری میں کیا تبدیلی کی؟

4.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ علی گڑھ تحریک کا تاریخی پس منظر واضح کیجیے۔

2۔ اردو ادب پر سید کے اثرات واضح کیجیے۔

3۔ علی گڑھ تحریک کے حوالے سے سرسید کی مجموعی خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔

4.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مقالات سرسید	سرسید احمد خان
2۔	علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز	مرتبہ نسیم قریشی
3۔	سرسید اور علی گڑھ تحریک	خلیق احمد نظامی
4۔	علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ	مظہر مہدی
5۔	سرسید کا نظریۂ تعلیم	افتخار عالم خان
6۔	سرسید احمد خاں اور ان کے معاصرین	راحت ابرار
13	سرسید احمد خان	میر نجابت علی

4.5.1 کے جوابات

a۔1	b۔2	b۔3	c۔4	c۔5
c۔6	c۔7	a۔8	d۔9	b۔10

اکائی 5 : سرسید کی نثر نگاری کی خصوصیات

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 سرسید کی نثر نگاری

5.2.1 مقالات ومضامین

5.2.2 صحافتی نثر

5.2.3 مکتوب نگاری

5.3 سرسید کا نثری اسلوب

5.4 علی گڑھ تحریک اور اردو نثر

5.5 اکتسابی نتائج

5.6 کلیدی الفاظ

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

انیسویں صدی کے ہندوستانی منظر نامہ پر طلوع ہونے والی علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی شخصیت سرسید احمد خاں بیک وقت ممتاز مفکر، دور بیں مدبر، عظیم دانشوراور دور رس صحافی تھے۔ وہ عظیم انشاپرداز اور جدید اردو نثر کے بانی بھی ہیں۔ سرسید احمد خان کو جدید اردو نثر کا بانی اس لیے تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے کلاسیکی نثر میں بہت سی اصلاحات کیں۔ انھوں نے کلاسیکی نثر کی عربی فارسی تراکیب، استعارات اور تشبیہات نیز مقفیٰ اور مسجع عبارات کو ختم کرکے سادہ اورآسان نثر کو رائج کیا۔ سرسید احمد خان اولین ادیب ہیں جنھوں نے نثر میں فارسی

زبان کی حد سے زیادہ آمیزش کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مقفیٰ اور مسجع متون کو آسان، سہل اور عام فہم بنانے کی طرف توجہ مبذول کی۔ انھوں نے عبارت آرائی سے زیادہ مطلب رسانی پر زور دیا۔ ان کی نثر نویسی کا مقصد اپنے خیالات و نظریات کو سادہ اور عام فہم انداز میں عوام تک پہنچانا تھا۔ اس اکائی میں سرسید احمد کی نثر نگاری کی خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔

سرسید احمد خان کی نثر نگاری کی اہم خصوصیات میں سادگی، سلاست، اور مقصدیت شامل ہیں۔ انھوں نے رنگین عبارتوں کے بجائے سادہ نثر لکھنے کی بنیاد ڈالی تاکہ ان کے نظریات وخیالات کی ترسیل آسانی سے ہوسکے۔ وہ مشکل لفظیات اور طویل فقرات سے اجتناب کرتے تھے۔ وہ عام بول چال کے الفاظ استعمال کرتے تھے تاکہ لوگوں تک ان کے خیالات آسانی سے پہنچ سکیں۔ سرسید احمد کی نثر سادہ، سہل اور عام فہم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے قارئین کو الجھن نہیں محسوس ہوتی۔ سرسید احمد خان اپنی سادہ نثر کی وساطت سے نہایت بے تکلفی سے عوام سے روبرو ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں آمد ہے آورد نہیں۔ سرسید کی نثر بہت سادہ اور رواں دواں ہے۔ چونکہ سادہ نثر کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزمرہ سے قریب تر ہو، یہی وجہ ہے کہ سرسید نے اپنی نثر کو اسی نصب العین پر پیش کرنے کی سعی کی۔ اس میدان میں وہ اسٹیل اور ایڈیسن سے بہت متاثر تھے۔ جس طرح ایڈیسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ادب کو درباروں اور محلوں سے نکال کر قہوہ خانوں اور بازاروں تک پہنچادیا، اسی طرح سرسید کی سادہ اور سلیس نثر کا بھی یہی اختصاص ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو خانقاہوں، درباروں اور کوچہ وبام سے نکال کر دفتروں، تعلیم گاہوں اور متوسط طبقے کے دل ودماغ تک پہنچادیا۔ سرسید نے اردو نثر کو اس قابل بنادیا کہ وہ علمی کام انجام دے سکے۔ سرسید پیچیدہ سیاسی مسائل، مذہبی نکات اور دشوار گزار اصلاحی مباحث کو بھی نہایت صفائی، سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ سرسید نے فلسفیانہ، سائنسی اور تنقیدی مضامین میں بھی سادگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

سرسید کی نثری تحریروں میں مقصدیت کا عنصر اس حد تک غالب ہے کہ انھیں زبان کے حسن اور ادب کی نزاکت وجمال پر توجہ دینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ ادب کو مقصدیت کا ذریعہ سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص طبقہ کے لیے نہیں لکھتے بلکہ قوم کے سبھی افراد کے لیے لکھتے تھے۔ انھوں نے نثر میں تکلف اور تصنع کا طریقہ نہیں اپنایا بلکہ سہل نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ سرسید نے اپنی نثر میں عربی فارسی کی گنجلک اور دورافتادہ اصطلاحیں استعمال نہیں کیں بلکہ ہر جگہ ان کی زبان عام فہم اور سلاست سے پُر ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریر کا جادو ہر شخص کو مسحور کرلیتا ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- سرسید کی سادہ، سلیس اور عام فہم نثر سے واقف ہوسکیں۔
- سرسید کے مقالات کی سلیس ورواں نثر سے آگاہ ہوسکیں۔
- سرسید کے خطوط کی دلکش نثر سے بہرہ ور ہوسکیں۔

- سرسید کی صحافتی تحریروں کے سادہ انداز سے باخبر ہو سکیں۔
- سرسید کی نثر نگاری کی جملہ خصوصیات سے آگاہ ہو سکیں۔

5.2 سرسید کی نثر نگاری

ہندوستان میں انیسویں صدی سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اسی صدی میں سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی اقدار بھی تبدیل ہوئے، جس کے نتیجے میں زبان وادب بھی متاثر ہوا۔ اسی صدی میں شمالی ہند میں اردو زبان کا رواج عام ہوا، اردو نثر فارسی اور عربی سے آزاد ہو گئی۔ اسی عہد میں میر جیسے اعلیٰ پایہ شاعر پیدا ہوئے اور میر کے بعد میر امن جیسا نثر نگار پیدا ہوا ساتھ ہی غالب کے ساتھ ہی سرسید جیسے نثر نگار نے جنم لیا، جسے جدید اردو نثر کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ جدید اردو نثر کا با قاعدہ سلسلہ سرسید کی تحریروں ہی سے شروع ہوتا ہے، سرسید ہی کے عہد میں اردو پورے طور پر علمی اور ادبی زبان کہلانے کی مستحق قرار پائی۔ سرسید کے عہد تک اردو نثر پُر تکلف فارسی آمیز عبارت اور دور از کار تشبیہات و استعارات سے آراستہ تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں سے لوگ متاثر تو تھے لیکن یہ اثر خاص حلقہ تک محدود تھا، قابل قبول انداز بیان وہی تھا جس میں "فسانہ عجائب" کا طرز نظر آتا تھا۔ سرسید کی طرز تحریر نے اردو ادب کا رخ بدل دیا۔ انھوں نے اردو نثر کو بے جا اضافتوں اور پیچیدہ تراکیب سے آزاد کرایا۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے اردو کو نیا روپ اور نیا آہنگ عطا کیا، لایعنی تشبیہات و استعارات اور شاعرانہ مبالغہ آرائی سے نثر کو پاک کیا۔ سرسید نے اردو نثر کو جو سادگی، صفائی اور سلاست دی وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں اردو شعر و ادب پر سرسید کی سلیس نثر کا کافی اثر رہا۔

شمال میں نثر کی ترقی بہت بعد میں ہوئی کیونکہ یہاں فارسی کی اجارہ داری تھی۔ اردو نثر کی ترقی کی پہلی کوشش فورٹ ولیم کالج سے تسلیم کی جاتی ہے، لیکن اس عہد کی نثری تحریروں کا انداز عربی و فارسی آمیز تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں پڑھائی جانے والی زبانوں میں اردو زبان کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ کالج کے پرنسپل گل کرائسٹ بھی اردو کے عالم تھے۔ انھوں نے اردو پر کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں اردو قواعد کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے قبل شاعری کی متعدد کتابیں دستیاب تھیں لیکن نثر کی کتابوں کا فقدان تھا، یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں نثری ادب پر زیادہ زور دیا گیا۔ یہ کتابیں سہل، سادہ اور آسان تھیں اور ان میں بول چال اور روزمرہ محاوروں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی مشہور کتابوں میں میر امن کی باغ و بہار ہے جس میں چار درویشوں کی کہانی بڑے لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی زبان دلی کی عام بول چال کی زبان ہے اور محاوروں کی شمولیت بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ دوسری اہم کتاب حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل ہے، جس میں حاتم طائی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ شیر علی افسوس نے بھی اسی نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں بہت سی ضروری تفاصیل درج ہیں۔ نہال چند لاہوری نے گل بکاولی کی کہانی مذہب عشق کے نام سے لکھی۔ کاظم علی نے شکنتلا ناٹک اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ اردو میں کیا۔ مظہر علی نے بیتال پچیسی لکھی۔ ان لوگوں کے علاوہ کئی دیگر مصنفین اور مترجمین نے مشہور کتابیں تصنیف کیں۔ فورٹ ولیم کالج میں بہت سی کتابیں مختلف علوم و فنون پر قصے کہانیوں کے علاوہ شائع کی گئیں، مثلاً خود گل کرسٹ نے دو جلدوں میں ہندوستانی اردو لغت چھاپا تھا جو پھر دوبارہ 1802ء میں چھپی۔ علاوہ ازیں قواعد بھی شائع

ہوئی۔روشن علی انصاری کی کتاب 'خلاصتہ الحساب'، 'تاریخ فرشتہ' 1807ء، تاریخ شیر شاہی، جہانگیر شاہی، 1809ء، واقعات اکبر' 1809ء وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں درسی کتابوں نے پہلی بار اردو نثر میں سادگی اور سہل بیانی کی ابتدا کی۔ یہ کام غیر ملکیوں کی تعلیمی سہولت کے لیے کیا گیا تھا لیکن یہ طرز تحریر بھی 1857ء سے پہلے تک رواج نہ پا سکا۔ ایک بار پھر علمی نثر نے دلی فورٹ ولیم کالج میں دستک دی جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا اور مختلف علوم وفنون پر مبنی اردو نثر انگریزی سے ترجمے کی صورت میں ہماری روایت کا حصہ بنی۔ جغرافیہ، تاریخ، ریاضی اور دیگر علوم سے متعلق مضامین جو درسی حیثیت رکھتے تھے سامنے آئے لیکن دقت یہ تھی کہ اب بھی مذہبیات کو ہی زیادہ دخل تھا۔ ستم یہ ہوا کہ دلی کالج میں فروغ پذیر علمی نثر کا ذخیرہ 1857ء کی بھیانک تباہی میں بری طرح سے برباد ہو گیا۔ اسی دلی کالج میں پہلے امتحان میں ایک مضمون نگاری کا پرچہ ہوا کرتا تھا۔ بہترین مضامین لکھنے والے کو انعامات بھی دیے جاتے تھے۔ ماسٹر رام چندر، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکا اللہ، مولانا صہبائی اور ان جیسے اور بھی بہت سے ادبا جو کالج سے تعلق رکھتے تھے، علمی نثر کے ارتقا میں اپنا رول ادا کیا۔ اس دور میں ماسٹر پیارے لال کی بھی ایک قابل ذکر شخصیت گزری ہے جنھوں نے علمی نثر کے فروغ میں اپنا رول ادا کیا۔

اردو کی نثری تحریروں کا یہ سلسلہ سر سید احمد خاں کے عہد تک چلتا رہا لیکن سر سید نے ماقبل کی نثر میں پائی جانے والی اردو عربی تراکیب، استعارات اور عبارت آرائی سے حتی الامکان گریز کیا۔ انھوں نے نثر کو مقفیٰ اور مسجع بنانے کے بجائے رواں اور سلیس بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کے اندر دلکش اور خوب صورت نثر لکھنے کی صلاحیت تھی، جس کی بدولت انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں بہترین اور عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کی بیشتر تحریروں میں سادگی، روانی اور بے باکی کا عنصر نظر آتا ہے۔ سر سید نے بے تکلف اور رواں نثر لکھنے کی ابتدا کی۔ انھوں نے اردو نثر میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کرنے کے لیے عملی طور پر تحریر کے عمدہ نمونے پیش کیے اور اپنے رفقا کو بھی اس سلسلے میں مسلسل تحریک دیتے رہے۔ ہندوستان میں نثر کی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب انگریزوں نے ملک کو پوری طرح اپنا غلام بنا لیا تھا۔ فرنگیوں نے صنعت و حرفت میں ترقی کی بنیاد ڈالی اور مغرب کے ادبی اصولوں کی برکتیں اردو ادب پر پڑنے لگی نتیجتاً عہد سر سید میں جتنے نثر نگار پیدا ہوئے اس سے قبل کے جملہ ادوار میں اتنے نثر نگار نظر نہیں آتے۔ چنانچہ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکا اللہ، وقار الملک اور ان سے قبل غالب نیز دیگر نثر نگاروں کی نثری تصانیف نے اردو نثر کے اسلوب کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس ضمن میں اردو ادب پر سر سید کے احسانات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سر سید سے قبل اردو ادب میں ماورائی قصوں، کہانیوں اور تذکرہ نگاروں کے تذکرے ہی موجود تھے۔ اعلیٰ نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا البتہ اسی عہد میں فورٹ ولیم کالج کی سلیس نثر، دہلی کالج کی علمی نثر اور مرزا غالب کی ادبی نثر نے اردو کو قصے کہانیوں سے باہر نکالا۔ غالب نے فارسی خطوط نویسی کو ترک کر کے اردو میں خط لکھنے کی ابتدا کی۔ غالب کا منفرد انداز اس قدر پسند کیا گیا کہ دوسرے نثر نگاروں کے لیے نمونہ بن گیا۔ غالب کے بعد سر سید کی نثری تحریروں نے آسان اور سلیس نثر کی بنا ڈالی۔ سر سید کی تحریروں میں موضوعات کا تنوع، منفرد اسلوب بیان اور نئے افکار عام فہم انداز میں ملتے ہیں۔ سر سید کا یہ انداز کسی کی تقلید میں نہیں تھا بلکہ ان کا ایجاد کردہ تھا۔ انھوں نے ادب میں عقلیت، نیچریت، تہذیب اور مادی ترقی کو بطور خاص جگہ دی، جن سے نثر میں ایک نئی طرز نگارش کا آغاز ہوا۔ سر سید کا یہ انداز غیر متعصب اہل قلم کے لیے مفید اور کارآمد ثابت

ہوا۔

سرسید کے مقاصد بہت اعلیٰ حیثیت کے حامل تھے، جن کی تکمیل کے لیے انھوں نے ادب کا سہارا لیا اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ انہوں نے موضوعات کے تنوع، زبان کی تشکیل، حسن تحریر اور مختلف اصناف کے لیے راستے بنائے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک زندہ زبان کے لیے ضروری ہے کہ نئے نئے الفاظ و تراکیب کو خود میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھے۔ وہ زبانوں کے الفاظ اور تراکیب ہمیشہ جذب کرتی رہے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی ساخت کے اعتبار سے مانوس سانچوں میں ڈھال لے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی اردو تصنیفات میں زبان کو وسعت دینے کے لیے ان انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا، جو عام فہم تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بے تکلفی سے انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کیے۔ خصوصی طور پر تہذیب الاخلاق میں انھوں نے بعض انگریزی اصطلاحات کو اردو جملوں میں براہِ راست استعمال کیا۔ مثلاً: سوشل رفارمر، سوسائٹی، رفارم، ایجوکیشن، کالج، کمیٹی، سویلائزیشن، پروگریس، سائنس، لٹریچر، گورنمنٹ، ڈپارٹمنٹ، سول، پولیٹیکل، مورل، فلاسفی، سائنٹفک، ایسوسی ایشن، لکچر، کالج ایجوکیشن وغیرہ۔ اس طرح سرسید نے جہاں اردو میں کسی جدید تصور کے لیے مناسب لفظ موجود نہیں تھا، وہاں انگریزی لفظ یا اس کا اردو قالب استعمال کیا۔ انھوں نے بعض انگریزی الفاظ کو اردو کے جملوں اور قواعد کے مطابق اس طرح استعمال کیا کہ وہ الفاظ اردو نثر کا حصہ معلوم ہونے لگے۔ سرسید کا مقصد محض انگریزی الفاظ کی نمائش نہیں تھا بلکہ وہ ایسی نثر کے خواہاں تھے جو سادہ، واضح، آسان، سلیس اور عام فہم ہو۔ اسی لیے انگریزی لفظیات کو وہ عموماً ضرورت کے مطابق استعمال کرتے تھے۔ سرسید نے انگریزی لفظیات کو اردو پر مسلط کرنے کے بجائے اردو کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ ان کے اس طرزِ عمل سے اردو نثر میں جدید علمی، سائنسی اور تعلیمی موضوعات کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہوئی اور اردو زبان کے دائرہ اظہار میں وسعت آئی۔

سرسید چونکہ مغربی تعلیم، تہذیب اور اقدار سے واقفیت رکھتے تھے، اس لیے ان کے مضامین میں مغربی اداروں، سیاسی نظام اور تعلیمی طریقوں سے متعلق انگریزی اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ سرسید کے عہد میں جدید علوم، مغربی تہذیب، سیاسی اداروں اور سائنسی افکار کے لیے اردو میں بہت سی اصطلاحات موجود نہیں تھیں، اس لیے انہوں نے بعض انگریزی الفاظ کو اردو رسم الخط میں لکھنے کی سعی کی۔ انھوں نے بعض اصطلاحات کا اردو ترجمہ بھی کیا، کہیں کہیں انگریزی لفظ کے ساتھ اردو میں بھی اس کی وضاحت کر دی۔ سرسید نے سائنس، فلسفہ، تعلیم اور معاشرت سے متعلق نئی اصطلاحات کے لیے انگریزی الفاظ سے مدد لی۔ اس سے اردو میں جدید علمی موضوعات بیان کرنا آسان ہوا۔ سرسید نے ادب میں انفرادیت، مقصدیت، ہمہ گیری، سنجیدگی اور معقولیت کو جگہ دی۔ انہوں نے صرف ادب اور زندگی کے رشتے کو ہی مضبوط نہیں کیا بلکہ ادب کا رشتہ عوام سے استوار کیا۔ انہوں نے ادیبوں کی ذہنی و فکری کاوشوں کو جمہور کی خدمات اور ترقی کے لیے مائل کیا۔ سرسید نے مغربی علوم و افکار سے استفادہ کرتے ہوئے اردو نثر میں جدید سائنسی اور عقلی خیالات کو متعارف کرایا۔ ان کی نثر نے اردو ادب کو جدید ذہنی رجحانات سے روشناس کرایا۔ سرسید کی نثر نگاری میں دلائل کے ساتھ ساتھ اثر انگیزی بھی پائی جاتی ہے۔

اردو نثر میں سرسید کا سب سے اہم کارنامہ بے تکلف اور استدلالی نثر کو فروغ دینا تھا۔ میر امن اور غالب نے اردو نثر کو ترقی کی جن راہوں پر گامزن کیا تھا، سرسید نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ سرسید نے اپنی تحریروں کے توسط سے نثر میں رائج خرابیوں سے نجات

دلائی۔ ان کی علمی وادبی کاوشوں کے نتیجے میں بہت سی نثری اصناف کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے عہد کے مصنفوں اور ادیبوں کو ایک مفید راہ دکھائی۔ ان کے تحقیقی، تنقیدی اور فکری خیالات سے ان کا عہد خاص طور پر متاثر ہوا۔ ادب میں موجود فرسودگی، روکھاپن اور جمود کو سرسید کی علمی وادبی کاوشوں نے دور کیا۔ سرسید نے اردو ادب کی ترقی میں ہمہ جہتی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اُردو ادب کو موضوعاتی، لسانی، اسلوبیاتی اعتبار سے متاثر کرنے کے علاوہ اردو ادب کی دیگر اصناف مثلاً تحقیق، تنقید، مضمون نگاری، سوانح نگاری وغیرہ کے لیے بھی راہیں ہموار کیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے انگلستان کے کئی اسفار کیے اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ انگریزوں کی ترقی اور ہندوستانیوں کی بدحالی کا بنیادی سبب کیا ہے۔ وہ لندن کے سوشل ریفارمر ایڈیسن اور اسٹیل کے تعمیری کاموں سے بہت متاثر تھے۔ اور وہیں یہ عہد کیا تھا کہ ہندوستان جاکر وہ بھی اسی قسم کا اخبار یا رسالہ جاری کریں گے۔ وطن واپس آکر سرسید نے اپنے عہد کو عملی جامہ پہنایا اور اپنے رسالوں میں کثرت سے مضامین لکھنے لگے۔ ان مضامین کی نثر سادہ، سلیس اور عام فہم ہوتی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے سرسید کی وفات کے بعد 'سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر' کے عنوان سے مضمون تحریر کرکے تفصیل کے ساتھ اردو زبان وادب پر سرسید کے احسانات کا ذکر کیا ہے، جس میں شبلی نے سرسید کو جدید اردو انشاپردازی کا امام اور مجدد قرار دیا ہے۔ اہلِ ادب اور نقادوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ سرسید کا عہد اردو ادب کا 'عہد زرّیں' تھا۔

5.2.1 مقالات و مضامین

سرسید جدید اردو نثر کے بانی بھی ہیں اور مقالہ نگاری کے بنیاد گزار بھی۔ سفر انگلستان کے دوران سرسید نے وہاں کے بعض صحیفوں کا بخوبی جائزہ لیا تھا اور انھیں ہندوستان کے اخلاقی اقدار، تہذیب وثقافت اور معاشرہ کو فروغ دینے کا یہ طریقہ بے حد پسند آیا۔ وہ اپنی قوم میں اصلاح اور بیداری لانے کے خواہاں تھے۔ لہٰذا انھوں نے طے کیا کہ ملک اور قوم کی حالت بدلنے کے لیے ایک رسالہ جاری کیا جائے، جس سے معاشرہ صحت مند اور اخلاقی اقدار کا حامل بنے، یہیں سے سرسید کی مقالہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔

سرسید کی نثر اور ان کا طرز نیز اسلوب نگارش آسان اور رواں دواں ہے۔ ان کے بیان اور زبان کی صفات الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔ سرسید کے مقالات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے، ان میں سیاسی، سماجی، اصلاح معاشرت، تاریخی، مذہبی، تعلیمی، ادبی، علمی، تحریکی، اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی موضوعات شامل ہیں۔ ان کے علم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کے منصوبے وسعت کے حامل تھے۔ وہ اپنے آپ میں تحریک تھے لہٰذا مذہب، تعلیم، تفسیر، سیرۃ النبی، تعلیم، اخلاق، منطق، فلسفہ، سائنس، صنعت وحرفت، صحافت، زراعت، سکہ شناسی، تہذیب وثقافت، علوم وفنون، تاریخ، تمدن، سیاست، معاشیات، سماجیات، زبان، شعروادب اور کتابوں پر تبصرے وغیرہ کوئی ایسا پہلو نہیں ہے، جس پر انھوں نے بحثیں نہ کی ہوں۔

سرسید کے مقالات کے موضوعات بہت متنوع ہیں۔ اس حوالے سے سرسید نے تقریباً دس ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل علمی اور ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا۔ سرسید کا تصنیفی سلسلہ 1840 میں "جامِ جم" سے شروع ہوکر زندگی کے آخری سال میں "ازواجِ مطہرات" (1898) لکھنے تک جاری رہا۔

تفسیر سے متعلق سرسید نے "تفسیر القرآن وھوالہدی والفرقان" تحریر کی۔ یہ تفسیر سورہ مریم تک یعنی نصف قرآن کی تفسیر ہے۔ اصول تفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے ایک کتابچہ کی صورت میں "تحریر فی اصول التفسیر" تحریر کیا، اس سے سرسید کے تفسیری نکات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ سرسید نے اپنی تفسیر میں بہت ہی آسان اور سلیس نثر کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے مختلف فیہ مسائل کو فلسفیانہ اور سائنٹفک انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کی نثر میں روانی اور افہام و تفہیم کی پوری صلاحیت ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> "قرآن مجید جب نازل ہوا تو عرب اس کو اپنے لہجہ میں پڑھتے تھے جیسا کہ اہل زبان کا دستور ہے اور علاوہ ادائے مخارج حروف کے جو اُن کی زبان تھی، وہ کسی لفظ کو زور دے کر پڑھتے تھے اور کسی جگہ وقفہ کر کر، کسی کو مد دے کر، اور کسی کو قصر کر کر، پچھلے عالموں نے اسی خیال سے آیات اور وقف مقرر کیے ہیں، مگر جب قرآن لکھا گیا تھا تو وہ ان اشاروں سے معرا تھا، پس یہ نشان آیتوں کے کسی کو ان کے تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتے، قرآن مجید کا طرز کلام اور اس کا مضمون خود بتاتا ہے اور ہر ایک محقق اور عالم بلکہ ہر ذی عقل و فہم اس کے معنی دریافت کر کر سمجھ سکتا ہے کہ کہاں مطلب ختم ہوا اور کہاں سے دوسرا مطلب شروع ہوا اور یہی سبب ہے کہ بعض علماء نے ایک ہی فقرہ کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں منقسم سمجھا ہے اور اس کی دو یا تین آیتیں قرار دی ہیں اور بعضوں نے کل فقرہ کو ایک ہی آیت سمجھا ہے اور اس سبب سے ایک عالم اسی ایک فقرہ میں دو یا تین آیتیں کہتا ہے اور ایک عالم ایک ہی، اور اب بھی ہر ایک مفسر مجاز ہے کہ بلحاظ ربط کلام کے جہاں وہ چاہے آیت قرار دے۔" (تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، سرسید احمد خاں، مشمولہ مجموعہ نثر سرسید، جلد بستم، مرتبہ عطاخورشید، 2026، ص:10)

سرسید غیر مسلموں کی طرف سے آنحضرت ﷺ پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہا کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" ہے جسے مختصر طور پر 'خطبات احمدیہ' کہا جاتا ہے۔ یہ تصنیف محض ایک فرد کے اعتراضات تک محدود نہیں بلکہ اس پورے فکری و فتنہ انگیز رویّے کا مدلل رد بھی ہے جو اُس عہد میں یورپی مستشرقین کی تحریروں کے ذریعے اسلام اور ذاتِ اقدسِ رسولِ اکرم ﷺ کے خلاف اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اسپرنگر، ڈین پرائیڈو، ایڈریان ریلانڈ، سائمن اوکلی اور ان جیسے دیگر نام سامنے آتے ہیں جن کی تحریروں میں تعصب، تحریف اور علمی بددیانتی نمایاں تھی۔ "خطباتِ احمدیہ" کو سیرتِ نبوی ﷺ پر اردو زبان میں لکھی جانے والی اولین باقاعدہ علمی و تحقیقی تصنیف ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس میں سرسید نے بہت ہی سلاست اور روانی کے ساتھ حضور اکرم کی حیات مبارکہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سرسید کی زبان کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہے:

- سرسید کی نثر میں الفاظ عام فہم اور آسان ہوتے ہیں۔

- سرسید کی نثر کے جملے رواں اور قدرتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔
- سرسید بات کو پیچیدہ بنانے کے بجائے صاف اور واضح انداز میں بیان کرتے ہیں۔
- سرسید' روزمرہ کے الفاظ کو اہمیت دیتے ہیں۔
- سرسید کی نثر کا مقصد صرف ادبی لطف نہیں بلکہ تعلیم، اصلاح اور شعور پیدا کرنا بھی تھا۔
- سرسید' غیر ضروری الفاظ اور بناوٹ سے گریز کرتے ہیں۔

سرسید نے اردو نثر کو سادہ، صاف، عام فہم اور مقصدی زبان عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں جدید اردو نثر کے اہم معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سرسید کی مقالہ نگاری کا بنیادی اختصاص اختصار اور جامعیت ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات و نظریات کو زیادہ طول دینے کے بجائے اختصار اور آسان بنا کر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری انھیں پڑھتے ہوئے اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور بے جا طوالت نہ ہونے سے مقالہ کا اثر باقی رہتا ہے۔ سرسید کے مقالات کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ وہ جامع اور موثر انداز میں اپنی بات کی ابتدا کرتے ہیں، درمیانی حصوں کو وسعت دیتے ہوئے مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں نیز اختتامی حصے پر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کے مقالات کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے۔

سرسید کے مقالات کا اہم اور بنیادی وصف مقصدیت اور افادیت ہے۔ وہ اپنے مقالات میں ثقیل اور گنجلک عربی و فارسی تراکیب نیز طویل جملوں سے شگفتگی اور مسرت نہیں پیدا کرتے بلکہ افہام و تفہیم اور آسان نثر میں اپنے مقصد اصلی کو بیان کر جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالات کے ذریعہ تعلیمی ترقی، اخلاقی اقدار، سویلائزیشن اور تمدن، توہمات و بدعات کو دور کرنے کی کوششیں کیں۔ انھوں نے اپنے مقالات کے ذریعہ مذہب کی ترویج، مغربی علوم اور علوم جدیدہ کی افادیت، سائنس و ٹکنالوجی کی حمایت، انگریزی تہذیب و شائستگی پر اصرار غرض ہر اعتبار سے عوام الناس اور ہندوستانی مسلم قوم کی اصلاح کا کام لیا۔ انھوں نے اپنے مقالات میں زندگی، کائنات، معاشرہ، انسان، وقت، خدا، جنت، جہنم، ملائکہ، پیغمبر، ماضی، حال، مستقبل، انسانی تاریخ، عمارتیں، کتب خانے وغیرہ کا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے مقالات کی نثر نہایت سادہ اور رواں دواں ہے۔ وہ تحقیقی اور سائنٹفک طریقہ کار سے اپنی تحریروں کو مستند، معیاری اور اعلیٰ بنانے کا ہنر جانتے تھے۔

سرسید احمد خان کو اردو مضمون نگاری کا بانی بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مغربی نثری صنف Essay کی طرز پر اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ وہ بیکن، ڈرائڈن، ایڈیشن اور سٹیل جیسے مغربی مضمون نگاروں سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے بعض انگریزی انشائیہ نگاروں کے مضامین کو اردو میں ترجمہ کرنے کا کام کیا۔ مضمون نگاری سے سرسید کا مقصد قوم کی اصلاح تھا لیکن انہوں نے اس کے لیے اُردو کو رابطہ کی زبان بنایا۔ انھوں نے آسان نثری پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے ادیب یا انشا پرداز کی حیثیت سے قلم نہیں اٹھایا لیکن ان کے مضامین میں جو ادبیت پائی جاتی ہے، وہ بلاشبہ ان کی ادبی حیثیت کو مستحکم کرتی ہے۔

ازواج مطہرات پر سرسید کا ایک معرکۃ الآرا مضمون ہے جسے وہ اپنی پایانِ عمر میں لکھ رہے تھے لیکن اسے وہ مکمل نہ کر سکے اور اس مضمون کو ادھورا چھوڑ کر وہ راہی ملک بقا ہوئے۔ یہ مضمون ایک عیسائی کے رسالہ ''اُمَّہات المومنین'' کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں حضرت رسالت مآب کی ازواج مطہرات پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ ''اُمَّہات المومنین'' میں سب سے بڑا اعتراض آنحضرت ﷺ کے

تعدد ازدواج پر کیا گیا تھا۔ سرسید نے تعدد ازدواج کے سلسلے میں تشفی بخش جواب دیا اور ہر زوجہ مطہرہ کا الگ الگ اور قدرے تفصیل سے ذکر کیا۔ لیکن یہ مضمون ادھورا رہ گیا اور گیارہ میں سے صرف سات یعنی حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینبؓ ام المساکین اور حضرت زینبؓ بنت جحش کے حالات لکھے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کا حال لکھنے والے تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔

اس کے علاوہ تعلیمات 'اُن کی سوچ کا محور تھا لہٰذا ایک ماہر تعلیم ہونے کے ناطے وہ مستقل طور پر تعلیم کے سلسلے میں مقالات و مضامین لکھا کرتے تھے۔ سرسید کو اسلامی دنیا کے ممالک سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے مصر اور ترکی کی تعلیمی و سماجی حالت پر گراں قدر مضامین تحریر کیے۔ صرف بیرونی ممالک ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف شہروں کے حالات و خصوصیات پر بھی ان کی نگاہ رہی، اور اس موضوع پر ان کی متعدد تحریریں "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے صفحات پر شائع ہوئیں۔

سرسید کی تاریخ نویسی سے دلچسپی کسی تعارف کی محتاج نہیں، یہ شوق اُن کی زندگی کے ابتدائی دور سے آخری دور تک نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور تصانیف "جام جم"، "سلسلۃ الملوک" اور "آثارالصنادید" اسی ذوقِ تاریخی کی زندہ مثالیں ہیں۔ عہد قدیم کی تاریخوں سے دلچسپی کے ساتھ عہد جدید کی تاریخوں سے بھی ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ محض عمومی تاریخ ہی نہیں بلکہ تاریخ کے ذیلی شعبوں میں بھی ان کی گہری دلچسپی رہی۔ سکہ شناسی اور فرامین کے موضوع پر ان کے مضامین اس بات کا ثبوت ہیں۔ سکہ شناسی کے اسی شغف کے تحت انھوں نے ایک مستقل کتاب لکھنے کا آغاز کیا تھا جو ادھوری رہ گئی، یہ سرسید کے علمی ذوق و تحقیقی رجحان کی ایک قیمتی یادگار شمار ہوتی ہے۔ سکوں پر لکھی عبارت پڑھنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا لہٰذا ہندوستانی قدیم سکوں کے علاوہ انگریزی سکوں پر بھی انھوں نے مضامین تحریر کیے ہیں۔

سرسید کی سماجی فکر اصلاحِ معاشرہ، عقل پسندی اور انسان دوستی پر قائم ہے۔ ان کے سماجی مضامین میں رسم ورواج کی اندھی پابندی پر تنقید اور سماجی برائیوں کے عملی حل کی جستجو نمایاں ہے، جیسا کہ "رسم ورواج" اور "رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات" میں بخوبی نظر آتا ہے۔ یتیم اور لاوارث بچوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں "لاوارث اور محتاج بچوں کی حفاظت" اور "ایک تدبیر یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش کی" جیسے مضامین ان کی ذمہ دارانہ سماجی سوچ کے مظہر ہیں۔ عورتوں کے حقوق پر ان کے مضامین—مثلاً "عورتوں کے حقوق"، "بیوہ عورتوں کا نکاحِ ثانی" اور "ہندوستان کی عورتوں کی حالت"—اس بات کی دلیل ہیں کہ سرسید سماجی اصلاح کو عورت کی شمولیت کے بغیر نامکمل سمجھتے تھے۔ مجموعی طور پر سرسید کی سماجی فکر روایت اور جدید تقاضوں میں توازن قائم کرتے ہوئے ایک صحت مند اور منظم معاشرے کی تشکیل کا واضح تصور پیش کرتی ہے۔

سرسید کی فکری و اصلاحی دلچسپی صرف مدرسۃ العلوم علی گڑھ تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ برصغیر کے مختلف علمی، تعلیمی اور سماجی اداروں کی پیش رفت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اسلامی مدرسہ عربی دیوبند، دہلی کالج، آگرہ کالج، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن اور کلکتہ یونیورسٹی جیسے اداروں پر ان کے مضامین اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مجموعی تعلیمی حالت کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے تھے۔ اسی طرح پٹنہ کے کتب خانہ خان بہادر خدا بخش خاں، ندیۃ العلما کانپور اور مدرسہ طبیہ مجیدیہ دہلی جیسے اداروں کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ سرسید کو جدید اور قدیم دونوں طرح کے علمی مراکز سے دلچسپی تھی۔ ان تحریروں سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ سرسید ایک فرد یا ایک ادارے کے

مصلح نہیں تھے، بلکہ وہ پورے معاشرے کے تعلیمی اور فکری ارتقا کے لیے کوشاں تھے۔

سرسید نے زبان و ادب بالخصوص اردو، فارسی و عربی ادب سے متعلق بھی عمدہ مضامین تحریر کیے، جو اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ ان کے نزدیک قومی اتحاد کی بنیاد باہمی احترام، مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی پر قائم تھی۔ عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مودت اور اتحاد جیسے مضامین میں وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے پیروکار اگر ایک دوسرے کے عقائد کا ادب کریں اور مشترک انسانی قدروں کو مقدم رکھیں تو معاشرہ امن و آشتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط کے عنوان سے لکھی گئی تحریر اس بات کی غماز ہے کہ سرسید ہندو مسلم اتحاد کو محض سیاسی ضرورت نہیں بلکہ ہندوستانی معاشرت کی ناگزیر اخلاقی بنیاد سمجھتے تھے۔ 'جلسہ اہل ہند و یوروپین' اور 'میرٹھ میں عید الضحیٰ' جیسے مضامین میں وہ عملی مثالوں کے ذریعے یہ دکھاتے ہیں کہ مختلف قومیں اور مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ میل جول اور حسنِ سلوک کے ذریعے کس طرح ایک مضبوط قومی فضا قائم کر سکتے ہیں۔ ان تمام تحریروں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سرسید کا تصورِ قومیت تنگ نظری سے پاک اور ہمہ گیر انسانی اخوت پر مبنی تھا، جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب کے لیے باعزت اشتراکِ حیات کی گنجائش موجود تھی۔

سرسید نے چھوٹے چھوٹے اصلاحی اور اخلاقی مضامین تحریر کیے، جن میں "دوستی، مخالفت، گذرا ہوا زمانہ، آتش بازی، امید کی خوشی، پردہ، ہمدردی، تعصب، حکایت ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیادار کی، کاہلی، اخلاق، خوشامد، اپنی مدد آپ، بحث و تکرار، حسد کی برائی، امید-دنیا بامید قائم ہے" وغیرہ جیسے موضوعات ہیں، جن کا مقصد ہمیشہ اصلاح رہا ہے۔ ایسے مضامین اکثر انھوں نے انگریزی سے ترجمہ کیے ہیں لیکن ان کی سادہ اور سلیس نثر کو دیکھ کر تخلیق کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> "اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک۔ اے آسمان کے تاروں تمہاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھوندلی چوٹیوں۔ اے پہاڑ کے عالیشان درختوں۔ اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹوں، تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے، تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔" (مضمون: امید کی خوشی، سرسید احمد خاں، مشمولہ مجموعہ نثر سرسید، جلد بستم، مرتبہ عطا خورشید، 2026، ص: 167)

5.2.2 صحافتی نثر

اردو صحافت کے ابتدائی عہد کے نمایاں صحافیوں میں سرسید احمد خاں کا نام اہم مقام رکھتا ہے۔ اپنے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اس کا ترجمان "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کے نام سے مارچ 1866 میں جاری کیا، جس کا نام

جون 1877 میں بدل کر 'علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کر دیا گیا۔ بعد ازاں لندن سے واپسی پر دسمبر 1870 میں انھوں نے اصلاح قوم اور فکری بیداری کے لیے مشہور مجلہ "تہذیب الاخلاق" کا آغاز کیا۔ ان دونوں جرائد میں سرسید نے صحافت اور قومی مسائل پر وقیع مضامین تحریر کیے۔ انھوں نے صحافت کو محض خبروں کی ترسیل نہیں بلکہ قوم کی ذہنی تربیت اور سماجی اصلاح کا موثر ذریعہ قرار دیا۔ صحافت اور فنِ صحافت پر ان کی تحریروں میں سچائی، ذمہ داری اور اعتدال پر خاص زور ملتا ہے۔ وہ صحافی کو محض لکھنے والا نہیں بلکہ سماج کے سامنے جواب دہ اور دیانت دار معلم سمجھتے ہیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے تہذیب الاخلاق نے اردو نثر کو تصنع و مبالغہ سے نکال کر سادہ، رواں اور عام فہم اسلوب عطا کیا۔ اس رسالہ ہی کے اثر سے اردو نثر اصلاحی، سائنسی، تعلیمی اور سماجی مضامین کو بیان کرنے کے قابل ہوئی۔ اسی کے ذریعہ سرسید نے اردو میں ادبی صحافت کو ایک نیا مقام عطا کیا۔ اس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ بھی سرسید نے اردو نثر کی اصلاحی کوششیں جاری رکھیں۔ دراصل سرسید کی سلیس نثر کے اولین نمونوں کی ابتدا تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے مضامین سے ہوتی ہے، جس کے بانی خود سرسید ہیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں سادہ، صاف، رواں، عام فہم زبان میں سنجیدہ، متین، مدلل اور سائنٹفک نثر لکھنے کی روایت قائم کی۔ ان کی نثر میں مفروضے، ابتدا، تمہید، درمیان، اختتام اور تکمیلیت و غیر تکمیلیت، موضوع، مقصد جیسے تکنیکی اور فنی ضابطوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ تہذیب الاخلاق سے قبل اردو نثر تصنع، تکلف، عبارت آرائی، قافیہ پیمائی و تک بندی، پیچیدگی، مشکل پسندی جیسے معائب کا شکار تھی۔ اس رسالے کے ذریعہ بے تکلفی، بے ساختگی، مدلل انداز بیان، قطعیت، سادگی اور متانت کو نثر میں بنیادی حیثیت حاصل ہوئی۔

تہذیب الاخلاق کے دور اول میں 112، دور دوم میں 23 اور دور آخر کے تقریباً 73 مضامین سرسید احمد خاں نے خود تحریر کیے جن کا انداز اصلاحی اور جس کی نثر رواں دواں تھی۔ ان مضامین میں مقصدیت اور تبلیغی رنگ پایا جاتا ہے۔ تبلیغی نثر اردو میں سرسید سے پہلے بھی موجود تھی لیکن اس کی زبان صاف اور سلیس نہیں تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے فن مقالہ نگاری کی ابتدا کی۔ سرسید کے اخبار سوسائٹی گزٹ اور تہذیب الاخلاق سے پہلے بہت سے اخباروں اور رسالوں میں مذہبی، اخلاقی اور علمی مقالے شائع ہوئے تھے۔ لیکن سرسید نے نئے موضوعات پر قلم اٹھایا، خوشامد، بحث و تکرار، رسم و رواج اور سویلزیشن وغیرہ پر انہوں نے صاف اور سادہ زبان میں مقالے لکھے۔ "تہذیب الاخلاق" میں ہر موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے، جو اس بات کی دلیل تھی کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے خیالات اور مضامین نہایت سادہ اور سلیس انداز میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق میں شائع شدہ مضامین کے سلسلہ میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی زبان سادہ، سلیس، عام فہم اور اس کا اسلوب رواں دواں، بامقصد، جامع اور حقیقت حال کی عکاس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریریں نہ صرف موثر ہوتی تھیں بلکہ ان میں خلوص و صداقت بھی پائی جاتی تھی۔ بطور خاص اس رسالہ میں عام فہم اور سادہ نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید نے زبان و بیان اور اسلوب کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے۔ ان مضامین میں فکر، زبان سادہ، سلیس، شستہ اور بیان موثر ہے اور اس رسالہ کے ذریعہ ان کی شخصیت میں ایک کامیاب صحافی ہونے کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

سرسید احمد خاں اردو کے اولین اخبار نویس ہیں جنھوں نے تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایسے مضامین لکھ کر شائع

کیے، جن کی سادہ نثر اور اسلوب میں قدامت محسوس نہیں ہوتی۔ سرسید نے زبان کو تمام قدیم تکلفات سے پاک کیا۔ انھوں نے غیر ضروری تمہیدوں اور مشکل فارسی اور عربی لفظیات کے استعمال سے اجتناب کیا۔ انھوں نے مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کا مضحکہ اڑایا اور اردو لکھنے والوں کو اس پختہ اور زریں اصول سے روشناس کرایا۔

سرسید نے اپنے مضامین میں جس طرح کی زبان استعمال کی، وہ آسان اور سادہ بھی تھی اور مربوط بھی۔ اسی وجہ سے سرسید کے اخبار کو عوام الناس میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سرسید نے اپنے اخبار میں ایسی زبان کو فروغ دیا جس میں اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے اخبار ورسائل میں ایسی زبان استعمال کی جو سہل بھی تھی اور ادبیت سے معمور بھی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی زبان صحافتی سے زیادہ ادبی تھی جس میں انگریزی کے مروج اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اردو کے نفیس اور بامحاورہ الفاظ بڑی خوب صورتی سے برتے جاتے تھے۔

اردو ادب خصوصاً اردو نثر کی ترقی میں 'تہذیب الاخلاق'، 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' نے اہم کردار ادا کیے۔ سرسید کے اخبارات نے عوام کو اردو نثر کے نئے رجحانات سے باخبر کیا۔ سرسید کی نثر میں شگفتگی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، اس کے لیے وہ کبھی کبھی ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن اس میں پھکڑ پن پیدا نہیں ہونے دیتے۔ سرسید کی تحریریں سنجیدگی کی حامل ہیں۔ چونکہ وہ ادب میں افادیت کے قائل ہیں، اس لیے ہر بات پر سنجیدگی سے غور کرتے اور اسے سنجیدہ انداز میں ہی بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کو طنز و مزاح کی زیریں لہروں سے آشنا کیا۔ انھوں نے اپنی سادہ اور طنزیہ نثر کے ذریعہ زندگی اور سماج پر تنقیدیں بھی کیں۔

الغرض سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق نے نیا شعور بیدار کرنے میں معاونت کی۔ سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعہ ذہنوں کو علوم سائنس کی نئی روشنی عطا کی۔ اردو نثر میں وسعت پیدا کی، سادگی و سلاست اور روانی سے مالا مال کیا۔ جدید نثر کی موجودہ ترقی سرسید کی مرہونِ منت ہے۔

5.2.3 مکتوب نگاری

غالب کو شاعری میں جو شہرت ملی، نثر میں بھی وہی مقام ان کو خطوط کی وجہ سے ملا۔ سلاست، سادگی اور بے تکلفی ان کے خطوط کا خاص وصف ہے۔ غالب نے اردو کو بے تکلفی، سادگی اور سلاست کا انداز بیان دیا۔ سرسید کے عہد میں اگرچہ ناول کی ابتدا ہو چکی تھی، لیکن داستانوں کا ماحول ختم نہیں ہوا تھا۔ غالب کی طرح سرسید نے بھی خطوط نگاری کے ذریعہ علم و ادب کی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے عظیم شخصیات کے نام جو خطوط لکھے وہ تعلیمی، سیاسی، علمی اور ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط میں وہ اپنے احباب سے تعلیمی، سیاسی، علمی اور ادبی موضوعات پر ہم کلام ہوتے ہیں۔ سرسید کے خطوط علمی و ادبی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان کی نثر سادہ، سلیس، رواں دواں اور عام فہم ہے۔

سرسید کے خطوط میں بھی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اعلیٰ مکتوب نگار کے لیے ضروری ہے۔ ان کے خطوط کے ذریعہ ہم سرسید کی علمی صلاحیت، تہذیبی اور اصلاحی سرگرمیوں، سیاسی نظریات کے علاوہ ادبی رجحانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سرسید کے خطوط میں جہاں

دوستانہ مراسلت ہے وہیں شوخی، بے تکلفی اور خلوص بھی نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط میں شوخی، طنز، پُر خلوص انداز تکلم، بے تکلفی اور جوش و جذبات دیکھے جاسکتے ہیں۔

سر سید اپنے مکتوب الیہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو ان کی مثنوی 'خواب امن' پر تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "..... آپ کی مثنوی "خواب امن" پہنچی، بہت دل خوش ہوا۔ در حقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے خیال کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو، جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہو گا اتنا ہی زیادہ مزہ دے گا۔ آپ لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضروری ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔ یہ کام ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں، ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاءاللہ ایک مضمون طویل اس بات میں لکھوں گا۔ ان دنوں میں بہ سبب صوم کچھ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کی اگر کوئی اور مثنوی علاحدہ چھپی ہو تو عنایت فرمایئے۔"
>
> (کلیات مکتوبات سر سید، (جلد دوم)، مرتبہ عطا خورشید، 2023، ص:۴۳۶-۶۳۶)

سر سید کے خطوط میں شوخی کے ساتھ علمی و ادبی مباحث بھی ہیں۔ ان میں جوش، ہمت، امید و کوشش کے عناصر بھی ہیں۔ حالات پر غور و خوض، مشکلات سے مقابلہ اور عملی کوششیں بھی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو سر سید نے نہایت آسان اور ترسیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ غرض کہ سر سید کا عہد نثر کا بھی عہد زریں تھا، سر سید خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اُن کی ادبی علمی اور قومی خدمت نے ملک و قوم کو متاثر کیا، سر سید کے عہد میں شمالی ہند میں اردو نثر کے اہم ترین مراکز یعنی دہلی اور لکھنو میں اردو نثر کو جو قدر و منزلت نصیب ہوئی وہ پہلے نہیں تھی۔ اس لحاظ سے سر سید کا عہد اور انیسویں صدی نثر کی صدی تھی۔ اس عہد میں بے شمار اردو اخبارات کی اشاعت بھی اردو نثر کے فروغ میں معاون ثابت ہوئی۔ آج کی جدید نثر سر سید کے عہد کی ارتقائی نثر ہی کا نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ سر سید کی تحریک کو نثر کی تحریک بھی کہا جاسکتا ہے۔

5.3 سر سید کا نثری اسلوب

سر سید سے قبل اردو نثر میں دو نمونے رائج تھے؛ ایک فارسی کے زیر اثر پُر تکلف اندازِ بیان جن میں صناعی، مقفیٰ و مسجع جملے، صنائع و بدائع کا استعمال، شاعرانہ انداز، خیال آرائی اور مشکل پسندی، جب کہ دوسری جانب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا سادہ سلیس عام فہم ہندوستانی زبان کا اثر لیے ہوئے طرزِ اسلوب، جس میں طرزِ بیان سے زیادہ مدعا کو اہمیت حاصل تھی۔ مرزا غالب نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس نثر کو شخصی تجربات سے آشنا کیا اور مدعا نویسی کو مزید حسن عطا کیا۔ سر سید کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسی طرز کو اپناتے ہوئے نثر کو

زندگی اور معاشرے کا ترجمان بنادیا۔ انھوں نے صداقت اور حقیقت کو نثر کی بنیاد بنایا اور مبالغہ، جھوٹ، انشاء اور پُر تکلف انداز کی تردید کی۔

سرسید کا خیال تھا کہ تحریر میں سادگی ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک مدعا سے زیادہ خیالات کی ترسیل زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں ترسیل کا مسئلہ بے حد اہم ہے یعنی جو چیز کہی جارہی ہے وہ پوری طرح قاری تک پہنچ جائے اور مضامین کی پیشکش میں صداقت کا دامن کبھی نہیں چھوٹنا چاہیے۔ حالی نے سرسید کی طرز تحریر کی خوبیاں سادگی، بے تکلفی و بے ساختگی اور مدعانویسی کو قرار دیا ہے اور اسے نیچرل طرز بیان کا نام دیا ہے یعنی جہاں تکلف اور تصنع کی ذرہ برابر گنجائش نہ ہو اور مطالب کی ادائیگی پوری طرح ہوتی ہو۔ ظاہر ہے سرسید مصلح قوم ہیں لہٰذا ان کی نثر میں افادیت کو اہمیت لازم ہے لہٰذا انشاء کے مقابلے ترسیل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

سرسید کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا جوش اور ولولہ بھی پایا جاتا ہے، جسے خطیبانہ جوش کہا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں تلقین اور ترغیب کا انداز بھی نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صناعی جو حالی یا شبلی کے مضامین کا خاصہ ہے سرسید کے یہاں مفقود ہے۔ ان کے یہاں اثر آفرینی بھی خوب ملتی ہے۔ وہ کسی بھی بات کو موثر انداز میں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے مزاج کی شوخی و بذلہ سنجی بھی ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے جس سے وہ تحریر کو خوشگوار بنادیتے ہیں وہ مکالمہ کے ذریعہ ڈرامائیت بھی پیدا کرتے ہیں اور طنز و ظرافت سے سٹائر اور ہیومر بھی۔

سرسید کی نثر کے اہم ترین اوصاف میں زبان کا سلیس اور آسان ہونا ہے۔ سرسید کی تحریروں میں شعوری طور پر بعض انگریزی الفاظ بھی مستعمل ہوئے ہیں، جس سے اردو زبان کو اصطلاحات اور الفاظ کی سطح پر وسعت ملی ہے اور آگے چل کر اسی نہج پر بہت سے انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اردو کا حصہ بن گئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کی تکرار طبیعت کر ضرور مکدر کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ سرسید نے جمع الجمع کا استعمال بھی خوب کیا ہے جیسے رسم سے رسوم اور رسوم سے رسومات وغیرہ۔ کہیں کہیں فقروں میں الجھاو بھی ہے۔ ترکیبوں میں ثقل ہے، حروف ربط و عطف کی تکرار ہے، بعض نامانوس الفاظ کا استعمال بھی ہے جس سے نثر کے ادبی حسن میں کمی واقع ہوئی ہے۔ حالی اور شبلی کے مقابلے سرسید کی تحریروں میں ادبی لطافت کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے اور تحریر کی خشکی بھی خوشگوار فضا کو معدوم کر دیتی ہے۔ کہیں کہیں طویل یا حد سے زیادہ چھوٹے چھوٹے پیراگراف بھی تحریر کا عیب بن جاتے ہیں۔ کسی مضمون میں خطیبانہ اور واعظانہ انداز اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ادب کی فضا مفقود ہو جاتی ہے۔ پھر بھی سرسید کی تحریروں کا اسلوب کئی اہم خصوصیات کا حامل ہے اور وہ اردو کے باقاعدہ پہلے نثر نگار اور مقالہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں جن کے وسیلے سے اردو نثر نے ترقی کے کئی منازل طے کیے۔

سرسید کے طرز بیان سے نہ صرف ان کے رفقاء متاثر ہوئے بلکہ ان کے تمام ہمعصروں پر اس اسلوب کا اثر ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ اثر خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی اردو نثر کا عہد سرسید ہی کا عہد ہے۔

5.4 علی گڑھ تحریک اور اردو نثر

اردو ادب پر سرسید کے کثیر الجہتی احسانات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید کے منجملہ کاموں میں 'علی گڑھ تحریک' کا قیام بھی ہے، جس کے ہمہ گیر مقاصد تھے۔ اس تحریک کا ایک مقصد اردو ادب اور نثر کی خامیوں کو دور کرنا بھی تھا۔ اس تحریک کے زیر اثر سرسید اور

ان کے رفقانے اردو ادب میں نمایاں اصلاحات کیں جن سے اردو ادب کی دنیا یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس تحریک نے بیک وقت ہندوستان کے عوام کو سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، علمی اور ادبی طور پر متاثر کیا اور ہر میدان میں اصلاحات کیں، لیکن اس تحریک کے بنیادی مقاصد میں 'تعلیمی بیداری' کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس تحریک نے اردو زبان و ادب میں جو کارنامے انجام دیے وہ نا قابل فراموش ہیں۔ علی گڑھ تحریک کے قیام سے قبل اردو ادب میں مافوق الفطرت قصے کہانیوں، داستانوں، تصوف، عشق و محبت اور درباری تہذیب کو غلبہ حاصل تھا۔ نثر میں تصنع، مبالغہ، عبارت آرائی، عربی و فارسی تراکیب اور پیچیدہ طرز بیان کا رجحان عام تھا۔ اس وقت کی نثر عوام کی دسترس سے دور، ارسال و ترسیل سے ماورا، بناوٹی اور ثقیل ہوتی تھی۔ ان تمام خرابیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سرسید نے آسان اردو نثر میں پُرمغز مضامین لکھ کر نثر کے میدان میں ایسی جدتیں پیدا کیں، جس کی مثال نہیں ملتی۔ علی گڑھ تحریک نے اردو زبان و ادب کو نہ صرف نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا بلکہ جدید موضوعات، طرزِ تحریر اور اسالیبِ بیان کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید نے اس تحریک کے توسط سے اردو نثر کو سادگی، روانی، افہام و تفہیم اور سلاست سے آشنا کیا۔ انھوں نے نثر کو مقصدی حیثیت عطا کر کے لوگوں کے قریب کر دیا۔ سرسید نے اردو نثر کو محض ادب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے مذہبی، سائنسی، سماجی اور تعلیمی اظہار خیال کا ذریعہ بھی بنایا۔

علی گڑھ تحریک کے پانچ بنیادی مقاصد تھے؛ تعلیم، سیاست، مذہب، ادب اور معاشرت۔

سرسید نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب کی مروجہ خامیوں کو دور کر کے اس میں اصلاح پیدا کرنے کا ذمہ اُٹھایا، چنانچہ اُن کی کوششوں سے مرصع اور ثقیل و گنجلک نثر کی دنیا تبدیل ہوگئی۔ اگرچہ سرسید کی ابتدائی تحریریں کلاسیکی انداز کی حامل ہیں اور ان میں عربی و فارسی تراکیب کا زور ہے لیکن جب انھوں نے مصلح قوم کی حیثیت سے اصلاح و تلقین کا سلسلہ شروع کیا تو سلاست، روانی، سادگی و بے تکلفی کا انداز اپنایا۔ سرسید کی نثر کا نمایاں اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو موضوعات و اسالیب کی سطح پر وسعت و ہمہ گیری عطا کی۔ سرسید کی نثری تحریریں سادگی و سلاست کے زیور سے آراستہ اور رواں دواں ہیں۔ ان کی نثر نہایت سلیس، عام فہم اور برجستہ جملے نیز چھوٹے چھوٹے فقرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ سرسید کی تحریروں کا نمایاں وصف موضوعات کا تنوع، سلاست و روانی اور ان میں موجود درد و اثر ہے۔ لہجے کے خلوص اور دردمندی نے سرسید کی نثر میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دی۔ سرسید کی نثر کی نمایاں خصوصیات میں محاکاتی وصف، طنز ملیح، ڈرامائی شان، تشبیہات و استعارات کا حسن، روزمرہ اور محاورات کا برجستہ استعمال، خطیبانہ انداز، سائنٹفک و تجزیاتی اسلوب نیز استدلال اور طرز ادا کی روانی شامل ہے۔

علی گڑھ تحریک نے اردو نثر کو ایسی توانائی عطا کی کہ وہ ملکی، سماجی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی مضامین کو سلیس و موثر انداز میں بیان کرنے کے قابل بن گئی۔ اسی تحریک کے زیر اثر "سائنٹفک سوسائٹی" کا قیام بھی عمل میں آیا، جس کا مقصد مغربی علوم کا انگریزی میں آسان ترجمہ کرنا تھا۔ اس کے تحت بہت سے مغربی علوم و فنون کا آسان اردو نثر میں ترجمہ کیا گیا، جس سے ہماری نثر توانا ہوگئی۔

سرسید احمد خاں کا شمار اردو نثر کے اہم معماروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو نثر کو علمی، عقلی، سادگی اور مقصدی انداز عطا کیا۔ ان کی نثر میں اصلاحِ معاشرہ، تعلیم، مذہب، عقل اور جدید علوم کی اہمیت نمایاں ہے۔ سرسید کی نثر عام طور پر سادہ، سلیس صاف اور رواں ہے۔ وہ مشکل لفظیات اور پیچیدہ اندازِ بیان سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں تاکہ بات عام قاری تک آسانی سے پہنچ سکے۔ ان کی نثر نگاری کا بنیادی

مقصد قوم کی اصلاح اور بیداری تھا۔ انہوں نے تعلیم، معاشرتی اصلاح اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے قلم اٹھایا۔ ان کی تحریروں میں محض ادبی لطف کے بجائے عملی مقصد نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں اصلاحِ معاشرہ کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی جہالت، فرسودہ رسم و رواج اور تعلیمی پسماندگی پر تنقید کی اور جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کی نثر میں تحقیق، مشاہدہ اور دلائل کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں خیالی اور مبالغہ آمیز باتوں کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز غالب ہے۔ وہ معاشرتی مسائل کو ان کی اصل صورت میں دیکھنے اور ان کے عملی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سرسید کی نثر کی نمایاں خصوصیات سادگی، سلاست، مقصدیت، عقلیت، استدلال، اصلاحی فکر، حقیقت پسندی، علمی انداز اور جدید خیالات ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو محض ادبی اظہار کا ذریعہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے قومی اصلاح، تعلیم اور فکری بیداری کا موثر وسیلہ بنا دیا۔ سرسید نے اردو نثر کو غیر ضروری تکلف اور فارسی آمیز پیچیدگی سے نکال کر سادہ، واضح اور جدید اسلوب کی طرف متوجہ کیا۔ سرسید احمد خان کی نثر کی ایک اہم خصوصیت سادہ، عام فہم اور آسان زبان ہے۔ وہ مشکل فارسی اور عربی الفاظ کے بجائے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے جو عام قاری آسانی سے سمجھ سکے۔ سرسید نے نسبتاً مشکل الفاظ کو آسان انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً:

ابتلا کے بجائے مشکل / آزمائش، استفسار کے بجائے پوچھنا، استفادہ کی جگہ فائدہ اٹھانا، اعانت کے بجائے مدد، اصلاح کی جگہ درستگی یا بہتری، معاشرت کی جگہ میل جول / رہن سہن، مصلحت کے بجائے بھلائی یا فائدے کی بات، مناقشہ کی جگہ بحث، مشقت کے بجائے محنت، مفاد کے لیے فائدہ، عداوت کے لیے دشمنی، طریقہ کار کے لیے کام کرنے کا طریقہ وغیرہ۔ اس طرح سرسید احمد خان کی نثر میں سادگی، وضاحت، اختصار اور عام فہم انداز دیکھا جاسکتا ہے۔

5.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- سرسید احمد خان کو جدید اردو نثر کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی نثر کی عربی فارسی تراکیب، استعارات اور تشبیہات نیز مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کو ختم کرکے سادہ اور آسان نثر کو رائج کیا۔
- سرسید احمد خان اولین ادیب ہیں جنھوں نے نثر میں فارسی زبان کی حد سے زیادہ آمیزش کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مقفیٰ اور مسجع متون کو آسان، سہل اور عام فہم بنانے کی طرف توجہ مبذول کی۔
- سرسید کا سب سے اہم کارنامہ بے تکلف اور استدلالی نثر کو فروغ دینا ہے۔ میر امن اور غالب نے اردو نثر کو ترقی کی جن راہوں پر گامزن کیا تھا، سرسید نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا۔
- سرسید نے اپنی تحریروں کے توسط سے نثر میں رائج خرابیوں سے نجات دلائی۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں کے نتیجے میں بہت سی نثری اصناف کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے عہد کے مصنفوں اور ادیبوں کو ایک مفید راہ دکھائی۔
- سرسید کی نثر اور ان کا طرز نیز اسلوب نگارش آسان اور رواں دواں ہے۔ ان کے بیان اور زبان کی صفات الگ شناخت قائم کرتے

ہیں۔ سرسید کے مقالات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچی ہے، ان میں سیاسی، سماجی، اصلاح معاشرت، تاریخی، مذہبی، تعلیمی، ادبی، علمی، تحریکی، اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی موضوعات شامل ہیں۔

- سرسید کی مقالہ نگاری کا بنیادی اختصاص اختصار اور جامعیت ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات و نظریات کو زیادہ طول دینے کے بجائے اختصار اور آسان بنا کر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری انھیں پڑھتے ہوئے اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور بے جا طوالت نہ ہونے سے مقالہ کا اثر باقی رہتا ہے۔
- سرسید کے مقالات کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ وہ جامع اور موثر انداز میں اپنی بات کی ابتدا کرتے ہیں، درمیانی حصوں کو وسعت دیتے ہوئے مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں نیز اختتامی حصے پر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کے مقالات کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے۔
- سرسید احمد خان کو اردو مضمون نگاری کا بانی بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مضمون نگاری سے سرسید کا مقصد قوم کی اصلاح تھا لیکن انہوں نے اس کے لیے اُردو کو رابطہ کی زبان بنایا۔ انھوں نے آسان نثری پیرایے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
- زبان و بیان کے اعتبار سے تہذیب الاخلاق نے اردو نثر کو تصنع و مبالغہ سے نکال کر سادہ، رواں اور عام فہم اسلوب عطا کیا۔ اس رسالہ کے ذریعے سرسید نے اردو میں ادبی صحافت کو ایک نیا مقام عطا کیا۔
- اس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ بھی سرسید نے اردو نثر کی اصلاحی کوششیں جاری رکھیں۔ دراصل سرسید کی سلیس نثر کے اولین نمونوں کی ابتدا تہذیب الاخلاق ہوتی ہے، جس کے بانی خود سرسید ہیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں سادہ، صاف، رواں، عام فہم زبان میں سنجیدہ، متین، مدلل اور سائنٹفک نثر لکھنے کی روایت قائم کی۔
- سرسید کے خطوط میں جہاں دوستانہ مراسلت ہے وہیں شوخی، بے تکلفی اور خلوص بھی نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط میں شوخی، طنز، پُرخلوص انداز تکلم، بے تکلفی اور جوش و جذبات دیکھے جاسکتے ہیں۔

5.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
متون	:	متن کی جمع، کسی کتاب، مضمون یا دستاویز کی اصل عبارت
عبارت آرائی	:	ایسے الفاظ، تراکیب اور اندازِ بیان اختیار کرنا جس سے تحریر میں رنگینی پیدا ہو جائے
لفظیات	:	ذخیرہ الفاظ، لفظی سرمایہ
اجتناب	:	پرہیز
آورد	:	تکلف، بناوٹ،
نصیب العین	:	مرکزی، اصلی، اساسی، اصلی مقصد سے متعلق

نیچریت : فطرت پرستی، حقیقت پسندی، فطرت نگاری

مقفیٰ : قافیہ دار، ایسا بیان یا تحریر جس میں ہم قافیہ اور ہم آہنگ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں

مسجع : وہ نثری عبارت جس کے جملے ہم قافیہ ہوں، وہ عبارت جس کے الفاظ آپس میں ہم قافیہ ہوں

نہج : طور طریقہ، انداز، روش، طرز، ڈھنگ

اسلوب : انداز، وضع، ڈھنگ، روش، طور، طریقہ

تصنع : بناوٹ، نمود و نمائش، دکھاوا

ملمع کاری : دکھاوا، وہ نظم جس میں ایک مصرع یا شق ایک زبان میں ہو اور دوسرا دوسری زبان میں۔

مترجمین : مترجم کی جمع، ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والا

ساخت : بناوٹ، ہیئت، صنعت، کاریگری

تذکرہ : سوانح حیات، شعراء کے حالات جو کتابی صورت میں مرتب کیے جاتے ہیں، یادداشت

طنز : طعنہ دینا، چھیڑ چھاڑ، جلی کٹی بات

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1-اردو نثر کا بانی کسے کہا جاتا ہے؟

(a)سرسید (b)محمد حسین آزاد (c)حالی (d)شبلی

2-سرسید سے قبل اردو نثر کی صورت حال کیا تھی؟

(a)پیچیدہ (b)ثقیل (c)گنجلک (d)سبھی

3-سرسید کس کی نثر نگاری سے متاثر تھے؟

(a)حالی (b)شبلی (c)اسٹیل وایڈیسن (d)محمد حسین آزاد

4-اردو عہد کا عہد زریں کس عہد کو کہا جاتا ہے؟

(a)عہد غالب (b)فورٹ ولیم کالج کا عہد (c)عہد سرسید (d)سبھی

5-علی گڑھ تحریک کے قیام کا مقصد تھا:

(a)اصلاحِ معاشرہ (b)اصلاح زبان (c)اصلاح تعلیم (d)سبھی

6-اردو میں مضمون نگاری کا بانی کسے کہا جاتا ہے؟

(a)سرسید (b)حالی (c)شبلی (d)ذکاءاللہ

7-اردو نثر کو تصنع و مبالغہ سے نکال کر سادہ، رواں اور عام فہم اسلوب عطا کرنے میں کس اخبار کا کردار زیادہ نمایاں ہے؟

(a)فکر و تحقیق (b)فکر و آگہی (c)تہذیب الاخلاق (d)فکر و نظر

8-خطوطِ سرسید کی نثر کی کیا خوبیاں تھیں؟

(a)جوش، ہمت، امید (b)علمی و ادبی مباحث (c)شوخی و بے تکلفی (d) سبھی

9-سرسید کو ''جدید اردو انشا پردازی کا امام اور مجدد'' کس نے قرار دیا ہے؟

(a)حالی (b)شبلی (c)وقار الملک (d)ذکاء اللہ

10-سرسید نے اپنی تحریروں میں کس زبان کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا؟

(a)عربی (b)فارسی (c)انگریزی (d)لاطینی

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ سرسید سے قبل اردو نثر کی صورت حال بیان کیجیے۔
2۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری خصوصیات کیا ہیں؟
3۔ علی گڑھ تحریک کے ذریعہ اردو نثر کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
4۔ مکتوباتِ سرسید کے حوالے سے نثر کے امتیازات بیان کیجیے۔
5۔ سرسید کی صحافتی نثر کی خوبیاں بیان کیجیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ علی گڑھ تحریک کے اردو نثر پر اثرات بیان کیجیے۔
2۔ مضامینِ سرسید کے حوالے نثر نگاری کی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
3۔ سرسید کی نثر نگاری کے امتیازات پر اظہار خیال کیجیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا 1975	انور سدید
2۔ رشید احمد صدیقی کے تنقیدی مضامین	رشید احمد صدیقی
3۔ خطبات احمدیہ	سید احمد خاں، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی
4۔ ادبی نثر کا ارتقا	شہناز انجم

5۔ سرسید اور اردو زبان وادب　　قمر الہدیٰ فریدی

6۔ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ　　قدسیہ خاتون

5.7.1 کے جوابات:

a۔1	d۔2	c۔3	c۔4	d۔5
a۔6	c۔7	d۔8	b۔9	c۔10

اکائی6: سرسید کے مضامین کا تجزیہ
(''گزرا ہوا زمانہ''اور'' امید کی خوشی'')

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 سرسید کے مضامین کا تجزیہ:''گزرا ہوا زمانہ''اور'' امید کی خوشی''

6.2.1 مضمون 'گزرا ہوا زمانہ' کا تعارف و متن

6.2.2 مضمون ''گزرا ہوا زمانہ' کا تجزیہ

6.2.3 مضمون ''امید کی خوشی'' کا تعارف و متن

6.2.4 مضمون '' امید کی خوشی'' کا تجزیہ

6.3 اکتسابی نتائج

6.4 کلیدی الفاظ

6.5 نمونۂ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

سرسید احمد خان اردو نثر میں جدید فکری رجحانات کے بانی اور مسلمانوں کی سماجی و تعلیمی اصلاح کے اہم رہنما شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کو جہالت، فرسودہ خیالات اور معاشرتی برائیوں سے نجات دلانے کی کوشش کی اور ان میں علم، عقل اور مثبت سوچ کا شعور پیدا کیا۔ ان کی نثر میں محض وعظ و نصیحت کے بجائے عقلی استدلال، عملی تجربے اور حقیقت پسندانہ طرزِ فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک کسی قوم کی ترقی اس وقت ممکن ہے جب اس کے افراد اپنی کمزوریوں کو پہچان کر اپنے رویوں اور خیالات

میں اصلاح پیدا کریں۔ گزشتہ اکائی میں آپ نے سر سید احمد خان کی نثر نگاری کا مطالعہ کیا۔اس اکائی میں آپ سر سید کے مضامین کے متن کو پڑھ کر ان کا تجزیہ کریں گے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مضمون ''گزرا ہوا زمانہ '' کا تعارف پیش کر سکیں گے۔
- مضمون ''گزرا ہوا زمانہ '' کے متن کی قرأت کر سکیں گے۔
- مضمون ''گزرا ہوا زمانہ '' کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں گے۔
- مضمون ''امید کی خوشی'' کا تعارف پیش کر سکیں گے۔
- مضمون ''امید کی خوشی'' کے متن کی قرأت کر سکیں گے۔
- مضمون ''امید کی خوشی'' کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں گے۔

6.2 سر سید کے مضامین کا تجزیہ: ''کاہلی'' اور '' خوشامد''

6.2.1 مضمون "گزرا ہوا زمانہ" کا تعارف و متن:

مضمون کا تعارف:

''گزرا ہوا زمانہ'' سر سید کا ایک نصیحت آمیز مضمون ہے جس میں انہوں نے وقت کی قدر اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ وقت رہتے ہوئے انسان کو اس کی قدر نہیں ہوتی ہے اور جب وقت ہاتھ سے چلا جاتا ہے تو وہ افسوس کرتا ہے۔ یہ مضمون وقت کی قدر، انسانی زندگی اور قومی خدمت کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی ایک سبق آموز تحریر ہے۔ مضمون میں ایک ایسے بوڑھے شخص کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو سال کی آخری رات اپنے گزرے ہوئے شب و روز کو یاد کر کے افسوس کرتا ہے۔ اسے اپنا بچپن، جوانی، ماں باپ، بہن بھائی اور دوست یاد آتے ہیں اور وہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی کا قیمتی وقت غفلت میں گزر گیا۔ اسے اپنی کوتاہیوں، عزیزوں کے ساتھ برے برتاؤ اور ایسے نیک اعمال پر بھی افسوس ہوتا ہے جن کا فائدہ دوسروں تک باقی نہ رہ سکا۔ اسی دوران اسے ایک خوب صورت دلہن دکھائی دیتی ہے جو ''ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی'' کی علامت ہے اور اسے بتاتی ہے کہ انسان کی حقیقی بھلائی دوسروں اور اپنی قوم کی خدمت میں ہے۔ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے کا یہ سارا تجربہ ایک نوجوان کا خواب تھا۔ وہ خواب سے بیدار ہو کر عہد کرتا ہے کہ اپنی زندگی کو قوم کی بھلائی کے لیے وقف کرے گا۔ یوں سر سید نوجوانوں کو وقت ضائع کرنے کے بجائے انسانیت اور قومی خدمت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' کا متن:

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ

اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر۔ اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جبکہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر، ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا، ''ہائے وقت، ہائے وقت، ہائے گزرے ہوئے زمانے۔ افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔''

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا، ''آہ ابھی بہت وقت ہے۔'' اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ''ابھی وقت بہت ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا، ''ہائے ہائے، میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات۔'' یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست، آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست، آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست، آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست، آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ''ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیوں کر اس کا بدل ہو۔''

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن۔ نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کی جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا،

"ہائے وقت، ہائے وقت، میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا،

"کہ تم کون ہو۔"

وہ بولی کہ "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔"

اس نے پوچھا کہ "تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔"

وہ بولی، "ہاں ہے۔ نہایت آسان، پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا، "واللہ لا ایزید ولا انقص۔" ادا کر کہ انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے۔ اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جا رہی رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے، انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔"

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دل فریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا،

"ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگا کر اس کی بلائیں لیں۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کر کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے، کیوں تو بیقرار ہے۔ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن۔ نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا،

"او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا او خدا تو میری مدد کر۔ آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین

6.2.2 مضمون "گزرا ہوا زمانہ" کا تجزیہ:

یہ مضمون ایک ایسے بوڑھے شخص کی داستان بیان کرتا ہے جو سال کی آخری رات تنہائی میں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ خوفناک موسم میں اپنے گھر کے اندر تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ باہر اندھیرا، تیز ہوا، گھنے بادل اور بجلی کی گھن گرج ہے، لیکن اس بوڑھے کی پریشانی کا اصل سبب موسم یا تنہائی نہیں بلکہ اس کی گزری ہوئی زندگی ہے۔ اسے احساس ہے کہ عمر کا ایک بڑا حصہ گزر چکا ہے اور اب وہ اپنے ماضی کو بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہی خیال اسے اندر سے بے چین کیے ہوئے ہے۔

وہ اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے۔ اسے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب زندگی ہر طرح کی فکر سے آزاد تھی۔ گھر میں والدین، بہن بھائی اور دوسرے عزیز اس سے محبت کرتے تھے۔ معمولی چیزیں بھی اسے بے حد خوش کر دیتی تھیں اور مکتب جانے کا زمانہ بھی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنے ہم جماعتوں کو یاد کرتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ بے فکری کے دن ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں۔ بچپن کی ان یادوں کے ساتھ اسے وقت کے گزر جانے کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور وہ افسوس کرتا ہے کہ اس نے زندگی کے اس قدر قیمتی لمحات کی اہمیت اس وقت نہیں سمجھی جب وہ اسے میسر تھے۔

اس کے بعد وہ اپنی جوانی کو یاد کرتا ہے۔ وہ اپنی صحت، خوب صورتی، طاقت اور زندگی کے جوش کو یاد کرتا ہے۔ اس دور میں اس کے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے اور اسے یقین تھا کہ اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے بہت وقت موجود ہے۔ والدین اسے نیکی، خدا پرستی اور اچھے اعمال کی نصیحت کرتے تھے، مگر وہ ان باتوں کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیتا تھا کہ ابھی بہت عمر پڑی ہے۔ تب بڑھاپے اور موت کا خیال اس کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ اب جب وہ ماضی کی طرف دیکھتا ہے تو اسے اپنی اس غفلت پر شدید افسوس ہوتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر جوانی میں ہی نیکی اور آخرت کی تیاری کی طرف توجہ دی ہوتی تو آج پچھتاوے کی یہ صورت درپیش نہ ہوتی۔

بوڑھے کی یہ حالت باہر کے خوفناک موسم سے بھی زیادہ پریشان کن ہے۔ وہ کھڑکی کھول کر آندھی، اندھیرے اور بجلی کی کیفیت دیکھتا ہے اور اپنی زندگی کو بھی اسی طوفانی رات سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی پوری زندگی غفلت، پریشانی اور بے مقصدی کے باعث ایک ایسی رات بن چکی ہے جس میں روشنی کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے بعد اسے اپنے وہ عزیز یاد آتے ہیں جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس کے ذہن میں ماں، باپ، بہن بھائی، دوست اور دوسرے متعلقین کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سب اس کے سامنے موجود ہوں۔ والدین کی محبت اور ان کی پرانی نصیحتیں اسے یاد آتی ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ اسے اپنی پچھلی غلطیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ اس نے کبھی والدہ کو رنج پہنچایا، کبھی والد کی بات نہیں مانی، بہن بھائیوں کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا اور دوستوں کے ساتھ بھی وہ ہمدردی نہیں برتی۔ اب ان لوگوں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ اپنی غلطیوں کی تلافی نہیں کر سکتا۔ یہی بے بسی اس کے پچھتاوے کو مزید شدید بنا دیتی ہے۔

کچھ دیر کے بعد اسے اپنی درمیانی عمر کا زمانہ یاد آتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس نے زندگی کے اس حصے میں بہت سے مذہبی اور نیک کام بھی کیے تھے۔ اس نے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کی، ضرورت مندوں کی مدد کی اور بعض فلاحی کام بھی کیے۔ ابتدا میں اسے خیال آتا ہے کہ شاید یہی اعمال اسے اطمینان دے سکیں، لیکن جلد ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ ان میں بھی اس کی نیت مکمل طور پر دوسروں کی بھلائی پر قائم نہیں تھی۔ بہت سے کام اس نے ذاتی ثواب یا اپنی نجات کی خواہش کے تحت کیے تھے۔ اس کے بنوائے ہوئے کنویں اور مسجدیں بھی وقت کے ساتھ ویران یا ختم ہو چکی تھیں اور جن لوگوں کی وقتی مدد ہوئی تھی، ان کی مشکلات بھی مستقل طور پر دور نہیں ہوئی تھیں۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ صرف ایسے کام کافی نہیں جن کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود رہ جائے۔

اسی دوران موسم بدلنے لگتا ہے۔ آندھی رک جاتی ہے، بادل چھٹ جاتے ہیں اور آسمان پر ستارے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی روشن ماحول میں بوڑھے کو ایک نورانی اور خوب صورت دلہن دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو۔ وہ جواب دیتی ہے کہ وہ

ہمیشہ باقی رہنے والی نیکی ہے۔ بوڑھا اس سے پوچھتا ہے کہ اسے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس پر وہ بتاتی ہے کہ ایسی نیکی وہ ہے جو انسانوں کی بھلائی اور بہتری کے لیے کی جائے۔ دنیا کی مادی چیزیں اور انسان کے بہت سے ذاتی اعمال وقت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں لیکن انسانیت کی حقیقی خدمت کا اثر ایک نسل سے دوسری نسل تک باقی رہ سکتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اپنی صلاحیت، وقت اور وسائل کو دوسروں کی بہتری اور بالخصوص اپنی قوم کی فلاح کے لیے استعمال کرے۔

یہ پیغام سن کر بوڑھا دوبارہ اپنے ماضی کا جائزہ لیتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے پچپن برس کی زندگی گزارنے کے باوجود انسانیت یا اپنی قوم کی حقیقی اور بے غرض خدمت کے لیے کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔ اس کی زندگی زیادہ تر ذاتی مفادات کے گرد گھومتی رہی۔ اسے اپنی اس کوتاہی کا شدید دکھ ہوتا ہے، کیونکہ اب اس کے پاس نہ جوانی باقی ہے اور نہ گزرے ہوئے وقت کو واپس لانے کا کوئی امکان۔ وہ شدت سے اس بات پر ملال کرتا ہے کہ کاش وقت دوبارہ مل جائے اور وہ اپنی زندگی نئے انداز سے گزار سکے، لیکن افسوس گزرا ہوا زمانہ اب واپس نہیں آ سکتا۔ مایوسی کے عالم میں وہ بے قرار ہو کر چلاتا ہے ہائے وقت۔۔۔ ہائے وقت، اور پھر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

یہ حالت دیکھ کر اس کے ماں باپ اور بھائی بہن دوڑ کر آتے ہیں اور اس گھبراہٹ اور بے چینی کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد کہانی ایک اہم موڑ لیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے کے بجائے ایک نوجوان ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے کی پوری زندگی کا مشاہدہ دراصل اس کا خواب تھا۔ اس کی ماں اسے محبت سے جگاتی ہے اور اسے زندگی کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے کہتی ہے۔ نوجوان اپنی والدہ کو پورا خواب سناتا ہے۔ ماں اسے سمجھاتی ہے کہ اسے اس بوڑھے کی طرح زندگی ضائع کر کے آخر میں پچھتانا نہیں چاہیے بلکہ خواب میں دکھائی دینے والی "ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی" کے راستے کو اختیار کرنا چاہیے۔

ماں کی بات نوجوان کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسے اپنی زندگی کے آغاز ہی سے اچھے کاموں اور دوسروں کی خدمت کو مقصد بنانا چاہیے۔ وہ عزم کرتا ہے کہ وہ وقت کو ضائع نہیں کرے گا اور اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کام کرے گا۔

مضمون کے اختتام پر سر سید براہِ راست نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو بے مقصد نہ گزاریں۔ وقت گزر جانے کے بعد پچھتاوے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اس لیے زندگی کی جوانی اور توانائی کو قوم اور انسانیت کی خدمت میں صرف کرنا چاہیے۔

اس طرح "گزرا ہوا زمانہ" محض ایک بوڑھے شخص کے پچھتاوے کی داستان نہیں بلکہ نوجوان نسل کے لیے ایک بیدار کرنے والا پیغام ہے۔ مضمون کا بنیادی سبق یہ ہے کہ وقت انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے؛ جو وقت گزر جائے وہ واپس نہیں آتا۔ حقیقی کامیابی صرف ذاتی فائدے یا رسمی نیکی میں نہیں بلکہ ایسے کاموں میں ہے جن سے دوسرے انسانوں اور معاشرے کو دیرپا فائدہ پہنچے۔ سر سید نوجوانوں کو ماضی کے پچھتاوے سے بچنے کے لیے حال کو درست طور پر استعمال کرنے اور اپنی قوم کی فلاح کے لیے عملی جدوجہد کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

6.2.3 مضمون ''امید کی خوشی'' کا تعارف و منتخب متن:

مضمون کا تعارف:

''امید کی خوشی'' سر سید احمد خان کی معروف نثری تحریر ہے، اس میں مصنف نے انسانی زندگی میں امید کی اہمیت، افادیت اور اس کی ہمہ گیر قوت کو نہایت مؤثر اور دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون دراصل امید کو انسانی زندگی کی ایسی قوت قرار دیتا ہے جو مشکل حالات، مصیبت، ناکامی، تنہائی اور موت کے خوف میں بھی انسان کو حوصلہ، تسلی اور آگے بڑھنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔ سر سید نے امید کو ''ایمان کی خوب صورت بیٹی'' سے تعبیر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ عقل کی اپنی حدود ہیں، لیکن امید انسان کو ان خوشیوں کا تصور عطا کرتی ہے جو ابھی اس کی دسترس سے بہت دور ہوتی ہیں۔

مضمون میں سر سید نے مختلف مثالوں کے ذریعے امید کی قوت کو نمایاں کیا ہے۔ ماں کی اپنے بچے سے وابستہ توقعات، حضرت یعقوبؑ کی حضرت یوسفؑ سے ملاقات کی امید، حضرت یوسفؑ کی قید میں امید، میدانِ جنگ میں سپاہی کا فتح پر یقین اور قوم کی بھلائی کے لیے جدوجہد کرنے والے مصلح کا حوصلہ، سب امید کی مختلف صورتیں ہیں۔ آخر میں سر سید یہ باور کراتے ہیں کہ زندگی کے آخری مرحلے اور موت کی گھڑی میں بھی امید انسان کو آنے والی لازوال زندگی اور دائمی خوشی کا سہارا دیتی ہے۔ یوں یہ مضمون امید کو انسانی زندگی کی بنیادی اور ناگزیر قوت ثابت کرتا ہے۔

مضمون ''امید کی خوشی'' کا متن:

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک، اے آسمان کے تارو، تمہاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دل کش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو؟ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو یہ خوب صورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھوں کو بھایا ہے، تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے؟ جس کو سب لوگ سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے۔ او نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، نیکی، نیکی کے لیے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس ساتھ رہی۔ تو ہی نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا، تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو ذلت سے نکالا اور پھر اس کو اس اعلیٰ درجہ پر پہونچایا جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا نا خدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینچنے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامیدوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ، اے میرے دل کی کونپل سورہ، بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے، تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے، کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے، سورہ میرے بچے سورہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہو گا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہو گی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا آخر کار ہمارے دل کو تسلی دے گی۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہو گی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی۔ تیری آواز ہمارے لیے خوش آیند راگنیاں ہوں گی، سورہ میرے بچے سورہ۔ اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ۔

بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے تو تم کیا کرو گے۔ تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہو گے۔ تم پوچھو گے اور ہم کچھ نہ بولیں گے۔ تم روؤ گے اور ہم کچھ نہ رحم کریں گے۔ اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کرو گے۔ آہ ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤ گے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ، اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے۔ آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہو گے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ سورہ میرے بالے سورہ۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا۔ اس کی پیاری آواز، ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہونچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اس کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں اور ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈتا ہے پر وہ نہیں ملتا۔ مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی۔ لہو بھرا دانتوں پھٹا کرتا دیکھتا ہے، پر ملنے سے ناامید نہیں۔ فاقوں سے خشک ہے۔ غم سے زار نزار ہے۔ روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھ وہ بے گناہ قیدی، اندھیرے کنوئیں میں سات تہہ خانوں میں بند ہے۔ اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یارو دیار غیر قوم، غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانے کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس گھر کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! تجھ ہی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے، ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت تجھ ہی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے۔ اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے۔ اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے۔ اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے۔ اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوتِ بازو۔ اور اے بہادری کی ماں۔ تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے، ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے، یگانوں بے گانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک

بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتوؤں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند عزیز اقارب سب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کر محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر۔ بہت سی ہمدردی کرتے ہیں، پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر۔ دل ہر وقت بے قرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بے قرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت۔ تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے، تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے، تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے۔ تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہر مراد کو پاویں گے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے مہدی کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید۔ جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی۔ رنگ فق ہو جاتا ہے۔ منہ پر مردنی چھاتی ہے۔ ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یاد گاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہو گی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسمِ بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے۔ گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوف ناک چیز ہے۔ او ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے جہاں سورج کی کرن اور زمانے کی لہر بھی نہیں پہنچتی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے، (۱) ایمان کے توشے۔ (۲) امید کے ہادی اور (۳) موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "امید" ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانے کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانے کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشتن، خفتن و مردن

6.2.4 مضمون ''امید کی خوشی'' کا تجزیہ:

سر سید احمد خان کا مضمون ''امید کی خوشی'' انسانی زندگی میں امید کی اہمیت اور اس کی طاقت کو نہایت خوب صورت اور مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ مصنف کے نزدیک امید ایسی قوت ہے جو انسان کو مشکلات، پریشانیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ انسان جس چیز کو اپنے سے دور دیکھتا ہے، وہ اسے زیادہ حسین اور پرکشش محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح مستقبل کی وہ خوشیاں جو ابھی حاصل نہیں ہوئیں، امید کے ذریعے انسان کو اپنے قریب محسوس ہونے لگتی ہیں۔ یہی احساس زندگی کو خوش گوار بناتا اور انسان کو جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔

مضمون کی ابتدا میں سر سید قدرت کے حسین مناظر کا ذکر کرتا ہے۔ آسمان پر چمکتی ہوئی دھنک، ستارے، بلند پہاڑ، گھنے درخت، خوب صورت بیل بوٹے، سرسبز کھیت اور بہتی ہوئی نہریں انسان کو متاثر کرتے ہیں۔ سر سید اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جو چیزیں ہم سے بہت دور ہوتی ہیں، وہ ہمیں زیادہ دلکش دکھائی دیتی ہیں۔ اسی اصول کو وہ انسانی زندگی پر منطبق کرتے ہیں۔ مستقبل کی خوشیاں بھی چونکہ موجودہ زندگی سے دور ہوتی ہیں، اس لیے انسان ان کی امید میں خوش رہتا ہے۔ اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ آنے والا وقت موجودہ حالات سے بہتر ہو گا۔

سر سید عقل اور امید کا تقابل بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل اگرچہ انسان کی رہنمائی کرتی ہے، لیکن اس کی رسائی محدود ہے۔ عقل موجودہ حالات اور ان چیزوں کو سمجھ سکتی ہے جو اس کے سامنے موجود ہوں مگر مستقبل کے بارے میں مکمل یقین نہیں دلا سکتی۔ اس کے برعکس امید انسان کو ان خوشیوں کا تصور دیتی ہے جو ابھی حقیقت نہیں بنیں۔ مشکل وقت میں یہی امید انسان کے دل کو تسلی دیتی ہے، اسے حوصلہ دیتی ہے اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔

سر سید کے نزدیک انسانی زندگی کی بہت سی نیکیاں اور اعلیٰ صفات بھی امید ہی کے سہارے پروان چڑھتی ہیں۔ امید خوشی کی خواہش پیدا کرتی ہے، خوشی انسان کو نام پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے، ناموری بہادری پیدا کرتی ہے اور بہادری کے ساتھ فیاضی، محبت اور نیکی جیسی خوبیاں جنم لیتی ہیں۔

مضمون میں مذہبی واقعات اور کرداروں کے ذریعے بھی امید کی وضاحت کی گئی ہے۔ سر سید اس پہلے انسان کا ذکر کرتے ہیں جو گناہ کے بعد مشکلات میں گھِر گیا تھا لیکن امید نے اسے مایوسی میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کا واقعہ پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ طوفان کے خطرناک حالات میں تھے اور ہر طرف تباہی نظر آ رہی تھی، تب امید ہی نے انہیں ثابت قدم رکھا۔ کشتی کا طوفان سے گزر کر محفوظ مقام تک پہنچنا امید اور یقین کی کامیابی کی علامت بن جاتا ہے۔ اس طرح مصنف یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ انتہائی مشکل حالات میں بھی امید انسان کو شکست تسلیم کرنے سے روکتی ہے۔

اس کے بعد سر سید ماں اور بچے کی مثال کے ذریعے امید کے ایک نہایت فطری اور جذباتی پہلو کو سامنے لاتے ہیں۔ ایک ماں اپنے گہوارے میں سوئے ہوئے بچے کو دیکھ کر اس کے مستقبل کے حسین خواب دیکھتی ہے۔ بچہ ابھی کچھ بولنے اور سمجھنے کے قابل نہیں مگر ماں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر کامیاب، نیک دل اور قابل انسان بنے گا۔ وہ اس کی خوش حالی، شہرت، اچھے کردار اور محبت کے خواب دیکھتی ہے۔ بچے کی معمولی سی مسکراہٹ، پہلی آواز، مکتب میں تعلیم حاصل کرنا اور والدین کے ساتھ عبادت کرنا اس کی امیدوں کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ امید انسان کے ساتھ بچپن سے بڑھاپے تک رہتی ہے۔

مضمون میں ایک بوڑھے باپ کی مثال بھی پیش کی گئی ہے جس کا بیٹا اس سے جدا ہو گیا ہے۔ بڑھاپے، غم اور مسلسل تلاش کے باوجود اس شخص کی امید ختم نہیں ہوتی۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر انتہائی کمزور ہو چکا ہے، لیکن بیٹے سے دوبارہ ملنے کی توقع اسے زندہ رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک بے گناہ قیدی کا تصور پیش کیا گیا ہے جو اندھیرے اور تنہائی میں قید ہے۔ اس کے لیے حالات نہایت تکلیف دہ ہیں، لیکن مستقبل میں آزادی اور بہتر وقت کی امید اسے اندر سے زندہ رکھتی ہے۔ اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ امید بسا اوقات انسان کے پاس موجود واحد سہارا بن جاتی ہے۔

میدانِ جنگ میں موجود سپاہی بھی امید کی طاقت سے محروم نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے موت کے خطرات، دشمن کی طاقت اور اپنے ساتھیوں کی قربانی کے مناظر ہوتے ہیں، لیکن فتح کی امید اس کے دل میں ہمت پیدا کرتی ہے۔ یہی امید اسے خوف پر قابو پانے اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی امید کا سہارا لیتا ہے جو اپنی قوم کی اصلاح اور بھلائی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ کہتے ہیں اور اس کی کوششوں کی قدر نہیں کرتے لیکن وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ ایک دن اس کی محنت کامیاب ہو گی۔ اس لیے امید اسے تنہائی، مخالفت اور ناکامی کے باوجود اپنے مقصد پر قائم رکھتی ہے۔

آخر میں سر سید امید کا تعلق موت اور آخرت کے تصور سے جوڑتے ہیں۔ جب انسان زندگی کے آخری مرحلے میں پہنچتا ہے، اس کی جسمانی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور موت قریب محسوس ہوتی ہے تب بھی امید اس کے دل کو سہارا دیتی ہے۔ ایمان رکھنے والے شخص کے لیے موت اختتام نہیں بلکہ ایک نئی اور دائمی زندگی کی طرف سفر ہے۔ اسی یقین کی وجہ سے موت کی سخت گھڑی بھی نسبتاً آسان محسوس ہونے لگتی ہے۔ مصنف کے نزدیک ایمان، امید اور موت انسان کے آخری سفر کے اہم ساتھی ہیں، مگر ان میں امید کو خاص مقام حاصل ہے۔

الغرض، ''امید کی خوشی'' کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ امید انسان کو مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر زندگی، عمل اور کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ مصیبت میں تسلی، ناکامی میں حوصلہ، جدوجہد میں طاقت اور مستقبل کے لیے یقین پیدا کرتی ہے۔ انسان اگر امید کا دامن چھوڑ دے تو مشکلات اس پر غالب آ سکتی ہیں، لیکن امید اسے دوبارہ اٹھنے اور کوشش کرنے کی قوت دیتی ہے۔ سر سید احمد خان نے اس مضمون کے ذریعے امید کو محض ایک جذباتی کیفیت نہیں بلکہ انسانی زندگی کو متحرک رکھنے والی بنیادی قوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون آج بھی انسان کو مشکلات کے باوجود مثبت سوچ، مسلسل محنت اور بہتر مستقبل کی جستجو کا سبق دیتا ہے۔

6.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- "گزرا ہوا زمانہ" میں ایک بوڑھے کے خواب کے ذریعے سر سید نے لوگوں کو اپنی زندگی اور گزرے ہوئے وقت پر غور کرنے کا پیغام دیا ہے۔
- وقت گزرنے کے بعد انسان صرف افسوس کر سکتا ہے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں رہتا۔ بچپن انسان کی زندگی کا ایسا دور ہے جس میں وہ فکر اور پریشانی سے آزاد ہو کر خوشیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔
- جوانی میں انسان مستقبل کے لیے بہت سے ارمان رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ابھی بہت وقت موجود ہے۔
- والدین کی نصیحتوں کو نظر انداز کرنے کا احساس انسان کو بعد میں شدید پچھتاوے میں مبتلا کر سکتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں دوسروں کے ساتھ محبت، ہمدردی اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔
- صرف ذاتی فائدے یا ثواب کی خواہش سے کیے گئے نیک کام حقیقی بے غرض خدمت کا درجہ نہیں رکھتے۔ وہ نیکی زیادہ دیرپا ہوتی ہے جس سے انسانوں، معاشرے اور قوم کو مستقل فائدہ پہنچے۔
- انسان کو اپنی جوانی، صلاحیت اور وقت کو ذاتی مفاد کے بجائے انسانیت اور قوم کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ زندگی کا صحیح مقصد وقت کو ضائع کیے بغیر ایسے کام کرنا ہے جن کے مثبت اثرات انسان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہیں۔
- "امید کی خوشی "میں سر سید نے امید کو انسانی زندگی کو متحرک رکھنے والی ایک اہم قوت کے طور پر پیش کیا ہے۔
- انسان کو دور کی چیزیں زیادہ حسین دکھائی دیتی ہیں اور مستقبل کی خوشیاں بھی اسی لیے اسے پرکشش محسوس ہوتی ہیں۔
- امید انسان کو موجودہ مشکلات کے باوجود بہتر مستقبل کی توقع اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔
- عقل کی رسائی محدود ہے، لیکن امید انسان کو ان خوشیوں کا تصور دیتی ہے جو ابھی حقیقت نہیں بنیں۔
- امید انسان کے اندر خوشی، بہادری، فیاضی، محبت اور نیکی جیسی اعلیٰ صفات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔
- انتہائی مشکل حالات میں بھی امید انسان کو مایوسی اور شکست تسلیم کرنے سے روکتی ہے۔
- ماں اپنے بچے کے مستقبل کے حسین خواب امید ہی کے ذریعے دیکھتی ہے، اگرچہ وہ بچہ ابھی ان خوابوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

- غم، جدائی، بڑھاپے اور قید جیسے حالات میں بھی امید انسان کے لیے زندگی کا سہارا بن سکتی ہے۔
- کامیابی کی امید انسان کو خوف اور مخالفت کے باوجود اپنے مقصد کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے کی طاقت دیتی ہے۔
- ایمان اور امید انسان کو موت کے خوف سے نکال کر آخرت کی دائمی زندگی پر یقین اور اطمینان عطا کرتے ہیں۔

6.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
نصیحت آمیز	:	نصیحت سے بھرا ہوا
اکتساب	:	حاصل کرنا
اشرفی	:	سونے کا پرانا سکہ
ریوڑی	:	گڑ اور تل سے بنی ہوئی مٹھائی
ہم مکتب	:	ایک ہی مکتب میں پڑھنے والا
خدا پرستی	:	اللہ کی عبادت اور اطاعت
ہولناک	:	انتہائی خوفناک
آشنا	:	جان پہچان والا
رنجیدہ	:	غمگین، دکھی
کج خلقی	:	بد اخلاقی
پاش پاش	:	ٹکڑے ٹکڑے، بہت زیادہ رنجیدہ
ادھیڑ پنا	:	درمیانی عمر کی حالت
جوبن	:	جوانی کا عروج
ولولہ	:	جوش، جذبہ
بہ نسبت	:	مقابلے میں، نسبتاً
مائل	:	راغب، متوجہ
تسخیر	:	قابو میں کرنا
سعی	:	کوشش
بدوی	:	دیہاتی، صحرائی باشندہ
پشیمان	:	شرمندہ، نادم

نوروز	:	بہار کا تہوار، نئے سال کا آغاز
ناگزیر	:	جس کے بغیر کام نہ چل سکے
ہمہ گیر	:	ہر طرف پھیلی ہوئی
دسترس	:	پہنچ، اختیار
ترغیب	:	شوق دلانا
فیاضی	:	سخاوت، دریادلی
آسودگی	:	سکون، اطمینان
خوش الحان	:	خوب صورت آواز والا
تقویت	:	طاقت، مضبوطی
گہوارہ	:	بچے کے سونے کا جھولا
لیاقت	:	قابلیت
خصلت	:	عادت، طبیعت
زار نزار	:	بہت کمزور اور لاغر
تدبیر	:	طریقہ، منصوبہ
یگانہ	:	قریبی، اپنا
بیگانہ	:	غیر، اجنبی
مصلح	:	اصلاح کرنے والا
شکستہ خاطر	:	دل شکستہ، غم زدہ
گوہرِ مراد	:	خواہش کی قیمتی چیز، مطلوبہ کامیابی
مردنی	:	موت جیسی کیفیت
بشاشت	:	خوشی، شادمانی

6.5 نمونۂ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ”گزرا ہوا زمانہ“ سرسید کا کس نوعیت کا مضمون ہے؟ ایک نصیحت آمیز مضمون ہے

(a) نصیحت آمیز (b) مزاحیہ (c) مذہبی (d) واعظانہ

2۔ برس کی اخیر رات کو بڑھے کے ساتھ گھر میں کون کون بیٹھا تھا؟ اکیلا

(a) بچے (b) اکیلا (c) گھر والے (d) بیوی

3۔ بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے کیا پھر رہا تھا؟ پچھلا زمانہ

(a) چاند (b) تصویر (c) دولت (d) پچھلا زمانہ

4۔ دلہن نے کہا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والی————ہے۔

(a) عورت (b) نیکی (c) ذات (d) دولت

5۔ مضمون میں خواب دیکھنے والا اصل میں کیسا ہے؟

(a) بوڑھا (b) کھیلنا (c) لڑکا (d) ادھیڑ

6۔ سرسید نے " یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی "کسے کہا ہے؟

(a) وہم (b) اعتماد (c) عقل (d) امید

7۔ گہوارہ میں کون سوتا ہے؟

(a) بچہ (b) بوڑھا (c) جوان (d) لڑکا

8۔ اس وقت جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا تب امید کی خوشیاں کس کو تھیں؟

(a) باپ (b) ماں (c) بھائی (d) بہن

9۔ کنویں میں قید بے گناہ قیدی کا چہرہ کیسا ہو گیا تھا؟

(a) سرخ (b) سیاہ (c) آسمانی (d) زرد

10۔ شہری کسے وحشی بتاتے ہیں؟ دوست آشنا کسے دیوانہ کہتے ہیں؟ اور عالم فاضل کسے کفر کے فتوؤں کا ڈر دکھاتے ہیں؟

(a) بوڑھے کو (b) سرسید کو (c) بچے کو (d) جوان کو

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' کا خلاصہ پیش کیجیے۔

2۔ مضمون ''امید کی خوشی'' کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3۔ سرسید احمد خان نے مضمون " گزرا ہوا زمانہ " میں کیا پیغام دینے کی کوشش کی ہے؟

4۔ سرسید نے "امید کی خوشی" کی ابتدا میں کس طرح کی منظر نگاری کی ہے؟

5۔ مضمون " گزرا ہوا زمانہ " میں بوڑھا اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کر کے کن باتوں پر افسوس کرتا ہے؟

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سرسید احمد خان کے نزدیک انسان کو وقت رہتے ہوئے کیا کیا کرنا چاہیے؟

2۔ مضامین "گزرا ہوا زمانہ" میں سرسید احمد خان کے اصلاحی افکار کا جائزہ لیجیے۔

3۔ سرسید احمد خان کے مضمون "امید کی خوشی" کے اسلوب پر روشنی ڈالیے۔

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مضامین سرسید	سرسید احمد خان
2۔	انتخاب سرسید احمد خاں	انور صدیقی
3۔	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق
4۔	سرسید اور ان کے کارنامے	نورالحسن نقوی

7.5.1 کے جوابات:

a۔1	b۔2	d۔3	b۔4	c۔5
d۔6	a۔7	b۔8	d۔9	b۔10

اکائی 7: سرسید کے مضامین کا تجزیہ
(''کاہلی''اور'' خوشامد'')

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 سرسید کے مضامین کا تجزیہ: ''کاہلی''اور'' خوشامد''

7.2.1 مضمون ''کاہلی'' کا تعارف و متن

7.2.2 مضمون ''کاہلی'' کا تجزیہ

7.2.3 مضمون ''خوشامد'' کا تعارف و متن

7.2.4 مضمون ''خوشامد'' کا تجزیہ

7.3 اکتسابی نتائج

7.4 کلیدی الفاظ

7.5 نمونۂ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے سرسید احمد خان کے دو مضامین ''گزرا ہوا زمانہ''اور''امید کی خوشی''کا مطالعہ کیا۔ سرسید احمد خان اردو نثر کے اولین عظیم مصلح، مفکر اور جدید شعور کے علم بردار ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور اخلاقی اصلاح کی بلکہ ان کی ذہنی تربیت اور فکری بیداری کی بھی بھرپور کوشش کی۔ ان کے مضامین کا مقصد محض نصیحت کرنا نہیں بلکہ دلیل، مشاہدے اور حقیقت پسندی کے ذریعے قوم میں صحیح طرزِ فکر پیدا کرنا تھا۔ "کاہلی "اور "خوشامد" انہی کے دو اہم اصلاحی مضامین ہیں،

جن میں فرد اور قوم کی اخلاقی و ذہنی کمزوریوں کا نہایت گہرا تجزیہ کیا گیا ہے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مضمون ''کاہلی'' کا تعارف پیش کر سکیں گے۔
- مضمون ''کاہلی'' کے متن کی قرأت کر سکیں گے۔
- مضمون ''کاہلی'' کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں گے۔
- مضمون ''خوشامد'' کا تعارف پیش کر سکیں گے۔
- مضمون ''خوشامد'' کے متن کی قرأت کر سکیں گے۔
- مضمون ''خوشامد'' کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں گے۔

7.2 سر سید کے مضامین کا تجزیہ: ''کاہلی'' اور '' خوشامد''

7.2.1 مضمون "کاہلی" کا تعارف و متن:

مضمون کا تعارف:

مضمون ''کاہلی'' سر سید احمد خان کا ایک اہم اصلاحی مضمون ہے، جس میں انہوں نے کاہلی کے حقیقی مفہوم کو واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک کاہلی صرف جسمانی سستی کا نام نہیں بلکہ عقل، فکر اور دل کی قوتوں کو بے کار چھوڑ دینا اصل کاہلی ہے۔ اس مضمون میں سر سید نے ذہنی بیداری، مسلسل محنت، خود اعتمادی اور علمی و فکری سرگرمی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ فرد اور قوم کی ترقی کا راز محنت، غور و فکر اور عقل کے صحیح استعمال میں پوشیدہ ہے، جبکہ بے عملی اور ذہنی جمود انسان کو پسماندگی اور زوال کی طرف لے جاتے ہیں۔ سادہ، منطقی اور مؤثر اسلوب میں لکھا گیا یہ مضمون اردو ادب کے بہترین اصلاحی مضامین میں شمار ہوتا ہے۔

مضمون ''کاہلی'' کا متن:

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ بمجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو

ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قوی کو بے کار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قوی کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے۔پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قوی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بےکار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج دازوں کا حال تھا اور وہ اپنے دلی قوی کو بھی بے کار ڈال دے تو اس کا کیا حال ہوگا۔یہی ہوگا کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔شراب پینا اور مردار کھانا اس کو پسند ہوگا، قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا اور یہی سب باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں، البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ، بد سلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضعدار وحشی ہوتا ہے۔ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوویں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے۔پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں جن کو ان کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور بر خلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصا انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لیے ایسے موقعے بہت ہیں۔اور اس میں کچھ شک نہیں کہ انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے، مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قوی کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو اگر اس کو حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اس کی فکر اور کوشش چاہئے کہ وہ قصور کیونکر رفع ہو۔

غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑے رہنا نہ چاہیے۔کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑے رہنا نہ چھوٹے گا، اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔نہایت حکیمانہ قول ہے کہ،

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

7.2.2 مضمون "کاہلی" کا تجزیہ:

سر سید احمد خان نے اپنے مضمون "کاہلی" میں کاہلی کے عام تصور کو بدلتے ہوئے اس کی ایک نئی اور گہری تشریح پیش کی ہے۔ عام طور پر لوگ کاہلی سے مراد جسمانی سستی، ہاتھ پاؤں سے کام نہ کرنا یا محنت و مشقت سے جی چرانا سمجھتے ہیں، لیکن سر سید کے نزدیک یہ مفہوم مکمل نہیں ہے۔ ان کے خیال میں اصل کاہلی جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور قلبی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے بڑا کاہل وہ شخص ہے جو اپنی عقل، فکر، شعور اور دلی قوتوں کو بے کار چھوڑ دیتا ہے۔ یہی اس مضمون کا مرکزی خیال ہے اور اسی تصور کو وہ پورے مضمون میں مختلف مثالوں، دلائل اور استدلال کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔

سر سید کے نزدیک جسمانی محنت زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، کیونکہ انسان اپنی روزی کمانے اور زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے محنت کرتا ہے۔ اسی لیے مزدور، کسان اور روزانہ محنت کرنے والے افراد عموماً کاہل نہیں ہوتے، کیونکہ مسلسل محنت ان کی عادت بن جاتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہیں معاشی آسودگی حاصل ہوتی ہے اور جنہیں روزگار کے لیے زیادہ جسمانی مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی، اگر وہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو بھی استعمال نہ کریں تو وہ حقیقی معنوں میں کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سر سید اس حالت کو نہایت خطرناک قرار دیتے ہیں، کیونکہ انسان کی اصل فضیلت اس کی عقل اور شعور میں ہے، نہ کہ صرف جسمانی طاقت میں۔

مصنف اس حقیقت پر بھی زور دیتے ہیں کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق عقل اور فکر کا ہے۔ اگر انسان اپنے دلی اور عقلی قویٰ کو استعمال نہ کرے، غور و فکر سے کنارہ کش ہو جائے اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بے کار چھوڑ دے تو وہ رفتہ رفتہ حیوانی صفات اختیار کرنے لگتا ہے۔ ان کے نزدیک جب عقل کی تحریک سست ہو جاتی ہے تو انسان اپنی اعلیٰ انسانی خصوصیات کھو دیتا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد محض کھانا، پینا اور جسمانی خواہشات کی تکمیل رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہری طور پر مہذب دکھائی دیتا ہے لیکن باطنی طور پر اس کی حالت ایک وحشی انسان سے مختلف نہیں رہتی۔

سر سید تعلیم کی اہمیت کو بھی اسی تناظر میں بیان کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر پڑھے لکھے شخص کو اپنی تعلیم کے مطابق ملازمت یا عملی موقع نہیں ملتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی عقل کو بے کار چھوڑ دے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف ملازمت حاصل کرنا نہیں بلکہ ذہنی صلاحیتوں کو بیدار رکھنا، مسلسل مطالعہ کرنا، نئی باتوں پر غور کرنا اور اپنی فکری قوت کو زندہ رکھنا ہے۔ انسان کو ہر حال میں اپنی عقل کو حرکت میں رکھنا چاہیے تاکہ اس کی ذہنی نشوونما مسلسل جاری رہے۔

اس مضمون میں سر سید ایک ایسے شخص کی مثال بھی دیتے ہیں جس کی آمدنی اس کے اخراجات کے لیے کافی ہے اور جسے معاش کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اگر ایسا شخص اپنی ذہنی قوتوں کو بھی استعمال نہ کرے تو وہ شراب نوشی، قمار بازی، تماشوں اور فضول مشاغل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سر سید نہایت طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ ایسا شخص صرف لباس، رہائش اور ظاہری تہذیب کی وجہ سے مہذب

نظر آتا ہے، ورنہ اس کی ذہنی کیفیت ایک وحشی انسان سے مختلف نہیں ہوتی۔ اس مثال کے ذریعے وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ ذہنی بے کاری انسان کو اخلاقی زوال کی طرف لے جاتی ہے۔

سرسید اس مضمون میں صرف فرد کی اصلاح پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پوری قوم کی اصلاح کی بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو اگر اپنی عقل اور فکر کو بروئے کار لانے کے مواقع کم ملتے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ خود ان کی کاہلی ہے۔ ان کے نزدیک اگر مواقع موجود نہ ہوں تو انہیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، مشکلات کو دور کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے اور اپنی محرومیوں کا ذمہ دار صرف حالات کو نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ وہ اپنی قوم کو خود احتسابی، خود اعتمادی، مسلسل جدوجہد اور عملی کوشش کی تعلیم دیتے ہیں اور یہی ان کے اصلاحی فلسفے کی بنیاد ہے۔

اس مضمون کا اسلوب نہایت سادہ، عام فہم، منطقی اور مؤثر ہے۔ سرسید نے روزمرہ زندگی کی مثالوں، عقلی دلائل، فلسفیانہ اندازِ فکر اور ہلکے طنز کے ذریعے اپنے خیالات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی زبان میں سادگی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ قاری کو محض نصیحت نہیں کرتے بلکہ دلیل اور مشاہدے کے ذریعے اس کے ذہن کو قائل کرتے ہیں، یہی ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

آخر میں سرسید ایک نہایت حکیمانہ شعر نقل کرتے ہیں:

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

یہ شعر دراصل پورے مضمون کا خلاصہ ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت کسی نہ کسی تعمیری، علمی، فکری یا عملی سرگرمی میں مصروف رہنا چاہیے۔ مجموعی طور پر "کاہلی" ایک ایسا اصلاحی، اخلاقی اور فکری مضمون ہے جس میں سرسید احمد خان نے واضح کیا ہے کہ قوموں کی ترقی کا راز مسلسل محنت، ذہنی بیداری، علمی جستجو اور عقل و فکر کے صحیح استعمال میں پوشیدہ ہے۔ جب تک افراد اور قومیں اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بیدار نہیں کریں گی، اس وقت تک حقیقی ترقی ممکن نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون آج بھی اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور قابلِ مطالعہ ہے۔

7.2.3 مضمون ''خوشامد'' کا تعارف و منتخب متن:

مضمون کا تعارف:

"خوشامد" سرسید احمد خان کا ایک اہم اصلاحی اور اخلاقی مضمون ہے، جس میں انہوں نے خوشامد کی برائیوں اور اس کے تباہ کن اثرات کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون ''تہذیب الاخلاق'' میں 1289 ہجری میں شائع ہوا تھا۔ سرسید کے نزدیک خوشامد انسان کی عقل، بصیرت اور کردار کو کمزور کر دیتی ہے اور اس میں خود پسندی، غرور اور حقیقت سے دوری پیدا کرتی ہے۔ اس مضمون میں وہ جھوٹی خوشامد اور سچی تعریف کے درمیان واضح فرق بیان کرتے ہوئے صداقت، خود شناسی اور کردار سازی کی تلقین کرتے ہیں۔ سادہ، منطقی اور اصلاحی اسلوب میں لکھا گیا یہ مضمون انسان کو خوشامد سے بچنے اور اپنی حقیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا پیغام دیتا ہے، اسی لیے یہ اردو ادب

کے اہم اصلاحی مضامین میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس مضمون میں انہوں نے خوشامد کی نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی حقیقت کو نہایت گہرے انداز میں بیان کیا ہے۔ سرسید کے نزدیک خوشامد صرف ایک اخلاقی برائی نہیں بلکہ ایک ایسا مہلک روحانی اور ذہنی مرض ہے جو انسان کی عقل، کردار اور شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس مضمون کا مقصد افراد اور خصوصاً قوم کے بااثر طبقے کو اس خطرناک بیماری سے آگاہ کرنا اور انہیں خود احتسابی، حقیقت پسندی اور دیانت داری کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

مضمون "خوشامد" کا متن:

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں یہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرضِ مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے، جسطرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے والے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔ اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے ہیں وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور انکی ایسی قدر کرتے ہیں جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اسی قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آ جاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے عقل و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری طبیعت پر بالکل غالب آ جاتا ہے۔ لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینے سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسا بننا چاہتے ہیں جیسے کہ در حقیقت ہم نہیں ہیں، تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں اچھی لگتی ہوں مگر در حقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بد زیب ہیں جیسے کہ دوسرں کہ کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں (اس بات سے ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں، یہ بات کہیں عمدہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں) کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور

چست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے کی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس چیز کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے، مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح خوشامد ایک بد تر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کے لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جنکی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص ہوتے ہیں، ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جسکی تعریف کرتے ہیں اسکے اوصاف ایسے جھوٹے اور نا ممکن بیان کرتے ہیں جن کہ سبب سے وہ تعریف، تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔ ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے، جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اسکا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بد نامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انہیں لوگوں پر اسکا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرما میٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

7.2.4 مضمون ''خوشامد'' کا تجزیہ:

اس مضمون کا آغاز نہایت مؤثر تمثیل سے ہوتا ہے۔ سرسید خوشامد کو جسمانی بیماری سے تشبیہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح بعض امراض انسانی جسم میں مہلک مادہ پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح خوشامد کا شوق انسان کے دل میں ایک ایسا زہریلا مادہ پیدا کر دیتا ہے جو جھوٹی تعریف اور فریب آمیز باتوں کو قبول کرنے لگتا ہے۔ اس تشبیہ کے ذریعے وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ خوشامد کا اثر محض وقتی نہیں بلکہ انسان کی پوری شخصیت پر مرتب ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک خوشامد دل اور دماغ کو اس قدر کمزور بنا دیتی ہے کہ انسان حق اور باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔

سرسید خوشامد کی نفسیاتی بنیادوں کا بھی نہایت باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ہر انسان ابتدا میں خود اپنی تعریف کرتا ہے اور اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دیکھتا ہے۔ جب یہ خود پسندی بڑھتی ہے تو رفتہ رفتہ دوسروں کی خوشامد بھی اسے پسند آنے لگتی ہے۔ اس طرح خود پسندی خوشامد کی قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ مصنف اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ خوشامد دراصل انسان کی کمزوریوں، احساسِ برتری کی خواہش اور غیر حقیقی شخصیت بنانے کے رجحان سے جنم لیتی ہے۔ یہ نفسیاتی تجزیہ سرسید کی گہری بصیرت کا مظہر

ہے اور ان کے مضمون کو محض اخلاقی نصیحت کے بجائے ایک فکری اور نفسیاتی مطالعہ بنا دیتا ہے۔

مصنف اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ خوشامد انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ جب کوئی شخص خوشامدیوں کی باتوں پر یقین کرنے لگتا ہے تو وہ ان کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی قوتِ فیصلہ متاثر ہوتی ہے اور وہ حقائق سے دور ہو جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک خوشامدی انسان کے سچے خیر خواہ نہیں ہوتے بلکہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خوشامد کو ایک ایسا زہر قرار دیتے ہیں جو آہستہ آہستہ انسان کی بصیرت کو ختم کر دیتا ہے۔

سرسید خوشامد کی ایک اور اہم وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب انسان ایسے اوصاف حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے جو حقیقت میں اس میں موجود نہیں ہوتے تو وہ خوشامدیوں کا محتاج بن جاتا ہے۔ خوشامد کرنے والے دوسروں کی خوبیاں اس کے سر باندھ دیتے ہیں اور وہ اس جھوٹی تعریف کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ مصنف نہایت خوبصورت مثال دیتے ہیں کہ دوسروں کے اوصاف کو اپنے اندر موجود سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی دوسرے کے کپڑے پہن لینا، جو نہ جسم پر درست بیٹھتے ہیں اور نہ شخصیت پر جچتے ہیں۔ ان کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ انسان جھوٹی تعریف سن کر خوش ہونے کے بجائے اپنے اندر واقعی وہ خوبیاں پیدا کرے جن کی تعریف کی جا رہی ہے۔ یہ خیال سرسید کے اصلاحی فلسفے کی بہترین نمائندگی کرتا ہے، کیونکہ وہ شخصیت سازی کو ظاہری تعریف پر ترجیح دیتے ہیں۔

مضمون میں خودی اور خوشامد کے تعلق کو بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ سرسید کے مطابق انسان کے اندر موجود خود پسندی اگرچہ بعض اوقات خاموش ہوتی ہے، لیکن خوشامد اسے بیدار کر دیتی ہے۔ نتیجتاً انسان غرور، تکبر اور خود نمائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر چھچھورا پن اور نمائشی پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی حقیقی شخصیت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح خوشامد صرف اخلاقی خرابی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ انسان کی شخصیت کا توازن بھی بگاڑ دیتی ہے۔ تاہم سرسید خوشامد اور سچی تعریف کے درمیان واضح فرق بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جھوٹی تعریف ایک برائی ہے، لیکن سچی، منصفانہ اور حقیقت پر مبنی تعریف نہایت مفید اور ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ایک اچھا شاعر یا ادیب وہ ہے جو کسی کی خوبیوں کو مبالغہ آرائی کے بغیر اس انداز سے بیان کرے کہ اصل حقیقت بھی برقرار رہے اور حسنِ بیان بھی قائم رہے۔ وہ مصور کی مثال دیتے ہیں جو تصویر میں اصل چہرہ بھی محفوظ رکھتا ہے اور اسے خوبصورت بھی بناتا ہے۔ اس مثال کے ذریعے وہ ادبی تنقید کا ایک اہم اصول بھی بیان کرتے ہیں کہ تعریف میں صداقت اور اعتدال ضروری ہے۔ اسی سلسلے میں سرسید مشرقی شاعری، خصوصاً ایشیائی شاعروں پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ اکثر مبالغے سے کام لیتے ہیں اور ممدوح کی ایسی غیر حقیقی صفات بیان کرتے ہیں جو ممکن ہی نہیں ہوتیں۔ ان کے نزدیک ایسی تعریف حقیقت میں تعریف نہیں بلکہ خیالی داستان بن جاتی ہے۔ اس تنقید سے سرسید کی حقیقت پسندی، اعتدال پسندی اور جدید ادبی شعور نمایاں ہوتا ہے۔ وہ ادب کو سچائی کا ترجمان دیکھنا چاہتے ہیں، نہ کہ مبالغہ آرائی اور خوشامد کا ذریعہ۔

مصنف ناموری اور نیک نامی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک سچی تعریف عمدہ خوشبو کی مانند ہے جو شخصیت کو معطر کرتی ہے، لیکن جھوٹی تعریف ایسی تیز بو ہے جو دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ باہمت اور باکردار انسان مناسب عزت اور جائز تعریف سے حوصلہ پاتا ہے، جبکہ بے جا خوشامد اس کی شخصیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اسی لیے وہ اعتدال، دیانت اور صداقت پر مبنی تعریف کو انسانی ترقی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے یہ مضمون سرسید کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ زبان سادہ، عام فہم اور پر اثر ہے۔ تشبیہات، استعارات، تمثیلات اور منطقی استدلال نے مضمون کو نہایت دلنشیں بنا دیا ہے۔ بیماری، زہر، خوشبو، مصور اور تھرمامیٹر جیسی مثالوں کے ذریعے انہوں نے پیچیدہ نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کو نہایت آسان انداز میں واضح کیا ہے۔ ان کا اسلوب واعظانہ ہونے کے باوجود خشک نہیں بلکہ دلائل، مشاہدات اور عملی مثالوں سے بھرپور ہے، جس کے باعث قاری نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ غور و فکر پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر "خوشامد" سرسید احمد خان کا ایک نہایت اہم اصلاحی، اخلاقی اور نفسیاتی مضمون ہے، جس میں انہوں نے خوشامد کی تباہ کاریوں، اس کے اسباب، اس کے نفسیاتی اثرات اور اس سے بچنے کے طریقوں کو مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے سچی تعریف اور جھوٹی خوشامد کے درمیان واضح فرق قائم کرتے ہوئے صداقت، خود شناسی، اعتدال اور کردار سازی کی تعلیم دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون آج بھی اپنی فکری گہرائی، اصلاحی پیغام اور ادبی اہمیت کے اعتبار سے اردو نثر کا ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔

7.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- کاہلی صرف جسمانی سستی کا نام نہیں بلکہ دل اور عقل کی قوتوں کو بے کار چھوڑ دینا اصل کاہلی ہے۔
- جسمانی محنت انسان کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری ہے، اس لیے مزدور عموماً کاہل نہیں ہوتے۔
- انسان کی اصل فضیلت اس کی عقل، فکر اور شعور میں ہے۔
- ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنے والا شخص رفتہ رفتہ حیوانی صفات اختیار کر لیتا ہے۔
- تعلیم کا مقصد صرف ملازمت حاصل کرنا نہیں بلکہ ذہنی صلاحیتوں کو بیدار رکھنا بھی ہے۔
- فارغ اور بے مقصد زندگی انسان کو شراب نوشی، قمار بازی اور دیگر برائیوں کی طرف مائل کرتی ہے۔
- اگر مواقع موجود نہ ہوں تو انہیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- قوموں کی ترقی مسلسل محنت، غور و فکر اور علمی سرگرمی سے ہوتی ہے۔
- خود احتسابی اور خود اعتمادی قومی اصلاح کی بنیادی شرط ہیں۔
- انسان کو ہمیشہ کسی نہ کسی تعمیری، علمی یا عملی کام میں مصروف رہنا چاہیے۔
- قوم کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ ذہنی کاہلی اور بے عملی ہے۔
- خوشامد انسان کے دل کی ایک مہلک اخلاقی بیماری ہے۔
- خوشامد انسان کی عقل، بصیرت اور قوتِ فیصلہ کو کمزور کر دیتی ہے۔
- خوشامد کی ابتدا انسان کی **خود پسندی** سے ہوتی ہے۔
- جھوٹی تعریف انسان کو اپنی حقیقی شخصیت سے دور کر دیتی ہے۔

- خوشامدی لوگ انسان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔
- دوسروں کے اوصاف اپنے اندر سمجھنا حقیقت سے فرار کے مترادف ہے۔
- انسان کو جھوٹی تعریف پر خوش ہونے کے بجائے اپنے اندر واقعی خوبیاں پیدا کرنی چاہییں۔
- خوشامد انسان میں غرور، تکبر اور خود نمائی پیدا کرتی ہے۔
- سرسید نے **خوشامد اور سچی تعریف** میں واضح فرق بیان کیا ہے۔
- سچی، منصفانہ اور حقیقت پر مبنی تعریف انسان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔
- مبالغہ آمیز تعریف ادب اور شاعری کی ایک بڑی کمزوری ہے۔
- ناموری سچائی اور کردار کی بنیاد پر حاصل ہونی چاہیے، نہ کہ جھوٹی تعریف کے ذریعے۔
- اچھا ادیب اور شاعر وہ ہے جو حقیقت کو برقرار رکھتے ہوئے تعریف کرے۔

7.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
کاہلی	:	سستی، بے عملی
دلی قویٰ	:	دل اور دماغ کی قوتیں، باطنی صلاحیتیں
قوائے عقلی	:	ذہنی اور فکری طاقتیں
بسر اوقات	:	زندگی گزارنا
طبیعتِ ثانی	:	پختہ عادت
حیوان صفت	:	جانور جیسی خصلت رکھنے والا
عارضی	:	وقتی، غیر مستقل
منتظر	:	انتظار کرنے والا
خصلت	:	عادت، فطرت
لاخراج دار	:	ٹیکس سے مستثنیٰ جاگیر دار
وحشیانہ	:	غیر مہذب، درندہ صفت
قمار بازی	:	جوا کھیلنا
تماش بینی	:	تماشے دیکھنے کا شوق
وضعدار	:	باوقار، شائستہ

پیچوان	:	حقے کی نلکی
مستعدی	:	چستی، آمادگی
مہلک	:	جان لیوا، نہایت خطرناک
مادہ	:	عنصر، کیفیت
وبائی	:	متعدی، پھیلنے والی
خوش گلو	:	خوش آواز
مکروفریب	:	دھوکا دہی
متصور	:	خیال کیا جانے والا، سمجھا جانے والا
وصف	:	خوبی، صفت
بدزیب	:	بدصورت، ناموزوں
خودی	:	خودپسندی، انا
چھچھوراپن	:	ہلکاپن، غیر سنجیدگی
تمیز	:	پہچان، شناخت
مصور	:	تصویر بنانے والا
خال وخط	:	چہرے کے نقوش
مبالغہ	:	حد سے زیادہ تعریف
واجب	:	مناسب، درست
عالی ہمت	:	بلند حوصلہ رکھنے والا
حقارت	:	ذلت، کمتر سمجھنا
پست ہمتی	:	کم حوصلگی
تھرمامیٹر	:	درجۂ حرارت ناپنے کا آلہ
تقویت	:	طاقت، مضبوطی
خودشناسی	:	اپنی حقیقت کو پہچاننا
استدلال	:	دلیل سے بات کرنا
تمثیل	:	مثال کے ذریعے وضاحت

7.5 نمونۂ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سرسید کے مطابق اصل کاہلی کیا ہے؟

(a) سونا (b) کھیلنا (c) عقل کو بے کار رکھنا (d) چلنا

2۔ کاہلی کس کی دشمن ہے؟

(a) دولت کی (b) ترقی کی (c)دوستی کی (d) صحت کی

3۔ انسان کی سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟

(a) جسم (b) مال (c) عقل (d) لباس

4۔ مزدور کیوں کاہل نہیں ہوتے؟

(a) وہ امیر ہیں۔ (b) وہ پڑھتے ہیں۔ (c)وہ سفر کرتے ہیں۔ (d) وہ محنت کرتے ہیں۔

5۔ سرسید "کاہلی" میں کس بات پر زور دیتے ہیں؟

(a) آرام پر (b) دولت پر (c) محنت پر (d) کھیل پر

6۔ خوشامد کا مطلب کیا ہے؟

(a) عبادت (b) جھوٹی تعریف (c) تعلیم (d) محنت

7۔ خوشامد کس چیز کو خراب کرتی ہے؟

(a) عقل کو (b) کپڑے کو (c) جسم کو (d) گھر کو

8۔ خوشامد سے کیا پیدا ہوتا ہے؟

(a) علم (b) غرور (c)صحت (d) دوستی

9۔ مضمون "خوشامد" کب شائع ہوا تھا؟

(a) 1252ھ (b) 1565ھ (c) 1289ھ (d)1280ھ

10۔ مضمون "خوشامد" میں سرسید کس چیز سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں؟

(a)خوشامد سے (b) تعلیم سے (c) محنت سے (d) مطالعہ سے

7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مضمون "کاہلی" کا خلاصہ پیش کیجیے۔

2۔ مضمون "خوشامد" کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3۔ سرسید احمد خان نے مضمون "کاہلی" میں کاہلی کی کیا تعریف کی ہے؟ وضاحت کیجیے۔

4۔ مضمون "خوشامد" میں خوشامد کے نفسیاتی اور اخلاقی اثرات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

5۔ فرد اور قوم کی ترقی میں عقل، فکر اور محنت کی کیا اہمیت ہے؟ مضمون "کاہلی" کی روشنی میں بیان کیجیے۔

7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سرسید احمد خان کے نزدیک خوشامد اور سچی تعریف میں کیا فرق ہے؟ مثالوں کے ساتھ بیان کیجیے۔

2۔ مضامین "کاہلی" اور "خوشامد" میں سرسید احمد خان کے اصلاحی افکار کا جائزہ لیجیے۔

3۔ سرسید احمد خان کے مضامین "کاہلی" اور "خوشامد" کے اسلوب پر روشنی ڈالیے۔

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مضامین سرسید	سرسید احمد خان
2۔	انتخاب سرسید احمد خاں	انور صدیقی
3۔	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق
4۔	سرسید اور ان کے کارنامے	نورالحسن نقوی

7.5.1 کے جوابات:

c۔1	b۔2	c۔3	d۔4	c۔5
b۔6	a۔7	b۔8	c۔9	a۔10

اکائی8: سفر نامہ مسافران لندن (ایک باب)

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		سفر نامہ: اجزااور تعریف
8.3		سر سید کی سفر نامہ نگاری
8.4		مسافران لندن: متن اور تشریح
8.5		اکتسابی نتائج
8.6		کلیدی الفاظ
8.7		نمونہ امتحانی سوالات
	8.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	8.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	8.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
8.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

سفر نامہ غیر افسانوی نثر کی ایک اہم صنف ہے جس میں عام طور پر کسی طویل سفر کی یا کسی بیرون ملک کے سفر کی روداد لکھی جاتی ہے۔ یہ روداد اتنی دلچسپ اور نفیس اردو میں ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سفر نامہ نگار جس بھی ملک کی سیر پر جاتا ہے تو اپنے گھر سے لے کر اس ملک تک پہنچنے کے دوران تمام طرح کی باریک سے باریک معلومات قلم بند کرتا ہے مثلاً اس کا سفر زمینی تھا سمندر کا، اس دوران اس نے کس کس ملک کے لوگوں کو دیکھا یا کس کس سے ملاقات ہوئی، کیسی کیسی تہذیبوں سے سامنا ہوا اور کیا کیا کھانے پینے کو میسر آیا حتیٰ کہ دوران سفر پیش آنے والے مشکلات کو بھی بڑی ہی باریکی سے لکھ دیتا ہے۔ سفر نامہ مسافران لندن مصلح قوم سر سید احمد خان کا لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔ اس میں انہوں نے لندن کے ان تمام مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں جہاں بھی وہ گھومنے گئے تھے۔ پروفیسر میور نے لائف آف محمد نامی کتاب لکھ کر آخری نبی حضرت محمد کی شان میں گستاخیاں کی تھیں۔ سر سید اسی کتاب کا جواب کتاب سے

دینے کی غرض سے لندن گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے خطبات احمدیہ جیسی کتا لکھ کر پروفیسر میور کو جواب دیا تھا۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- سفر نامہ مسافران لندن کی وجہ تصنیف کو سمجھ سکیں۔
- پروفیسر میور کی لائف آف محمد نامی متنازع کتاب کے بارے میں جان سکیں۔
- لائف آف محمد کتاب کے جواب میں سرسید کی خطبات احمدیہ کی وجہ تخلیق کو سمجھ سکیں۔
- انگریزوں کی ترقی میں تعلیمی نظام کے کردار کو سمجھ سکیں۔

8.2 سفر نامہ: تعریف اور فن

سفر عربی زبان کا لفظ ہے اور اسی سے سفر نامہ لفظ وجود میں آیا۔ سفر کا مطلب یہی ہے کہ کسی ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا۔ قدیم زمانے میں انسان کسی بھی جگہ پر جانے کے لیے پیدل یا پھر گھوڑا، خچر، اونٹ یا ہاتھی جیسے جانوروں کی مدد لیا کرتا تھا لیکن بدلتے وقت کے ساتھ جدید تکنیک کے آ جانے سے آج مختلف قسم کی گاڑیاں سواریاں مہیا ہیں جو ہمیں سفر کرنے میں آسانیاں پیدا کرتی ہیں اور ساتھ ہی وقت بھی بچاتی ہیں کیوں کہ اب گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔ خشکی، بحری اور ہوائی ہر طرح کے راستے سے سفر کیا جا سکتا ہے۔ سفر نامہ اردو کی نثری صنف ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کہ سفر کی روداد بیان کرنا۔

یہ تو اس کی محض لفظی یا عام سی تعریف ہوئی۔ سفر نامے کی اصل تعریف تو یہ ہو گی کہ سفر کے دوران پیش آنے والے، واقعات، تجربات اور سانحات کو فن کاری کے ساتھ قلم بند کیا جائے جو محض روز نامچہ، ڈائری یا یاد نگاری کے طور پر ہی نہ پڑھا جائے بلکہ اس کی شگفتہ اور دلچسپ نثر اور انداز بیان میں ایسی مقناطیسیت بھی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والے کو باندھ کر رکھے اور مزید پڑھنے پر مجبور کر دے۔ حالاں کہ یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے اور لوگ کہیں بھی جاتے ہیں تو وہاں کی ویڈیو گرافی کر کے سوشل میڈیا پر اپلوڈ کر دیتے ہیں لیکن جو لطف پڑھنے میں آتا ہے وہ کسی ذرائع سے نہیں آ سکتا۔

سفر نامہ عام طور پر نثر میں ہی لکھا جاتا ہے تو اس میں بھی بیان کنندہ یعنی راوی ہوتا ہے جو مختلف مناظر، کارگزاریوں اور بہت سی باریک تفصیلات کو بھی اپنے اندر سمونے کی پوری کوشش کرتا ہے جس سے پڑھنے والے پر یہ تاثر جاتا ہے کہ سفر نامہ نگار نے بہت عرق ریزی سے یہ سفر نامہ لکھا ہو گا۔ سفر نامہ نگار میں بات میں سے بات پیدا کرنے کا ہنر بھی ہوتا ہے اور وہ پیش کیے جانے والے واقعے کو کسی اور واقعے سے مماثل بھی قرار دے دیتا ہے اور بعض اوقات وہ کسی اشعار سے بھی اپنی بات کو وزن دار بناتا ہے۔ جس طرح صنف مرثیہ میں بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں مثلاً اس میں ڈرامائی کیفیت، پلاٹ، داستان، شاعری اور اخیر میں تزکیہ نفس بھی ہو جاتا ہے ٹھیک ویسے ہی سفر نامہ غیر افسانوی ادب کی ایسی انوکھی صنف ہے جس میں رپورتاژ، ڈائری، یاد نگاری، انشائیہ نگاری، روز نامچہ اور خود نواشت جیسی خوبیاں بھی

پائی جاتی ہیں اس لحاظ سے اس میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ سفر نامہ میں کئی اصناف کی خوبیاں یا جھلک ہونے کے سبب اسے ام الاصناف بھی کہا جاتا ہے۔ اس ذیل میں احمد سعید صاحب کا ایک مختصر سا اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ادب ہے جس میں سیاح یا مسافر دوران سفر یا اختتام سفر پر کسی ملک، یا شہر کے بارے میں اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات قلم بند کرتا ہے۔ یہ واحد صنف ہے جس میں بہت سی اصناف کی علمی خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس کو ام الاصناف کہا گیا ہے۔ اس کو علم و آگہی کے دستاویز سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔"

(احمد سعید، آزادی کے بعد اردو سفر نامہ، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2012، ص:9)

مندرجہ بالا اقتباس سے سفر نامے کے اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور کئی اصناف کی خوبیاں ہونے کے سبب ہی اسے ام الاصناف کہا جاتا ہے۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں سفر نامہ کو ظفر یعنی فتح کا وسیلہ تعبیر کیا گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں جو بڑے بڑے انقلاب اور ترقیاں آئی ہیں ان کے پیچھے بھی سفر ہی کارفرما ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سفر میں برکت ہے۔ بہر کیف! دوسرے ممالک یا شہروں میں گھومنے سے علم میں بیش بہا اضافہ تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی زندگی کے نشیب و فراز اور حقائق سے بھی روبرو ہونے کا موقع میسر آتا ہے۔ اسی لیے خواجہ میر درد کا شعر کتنا موزوں ہے:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

انسان اس دنیا میں جب سے ہے تب سے وہ مسلسل سفر ہی کر رہا ہے کیوں کہ سفر اس کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ پھر وہ چاہے کاروبار کے سلسلے میں سفر درپیش ہو یا پھر سیر و تفریح کی غرض سے، یا پھر تعلیم کے حصول کے لیے۔ سفر تو انسانی زندگی کا مقدر ہے جسے کسی نہ کسی صورت میں انسان کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔ جب وہ ان تمام وجوہات کی بنیاد پر سفر کرتا ہے اور اپنے تجربات کو یادگار بنانے کے لیے یا پھر ان مناظر محفوظ کرنے کے لیے وہ ان خوبصورت لمحات کو قلم بند کرتا ہے تو اسی کو سفر نامہ کہا جاتا ہے۔ یہ سفر نامے ان مسافروں کی زندگی کی ان روشن دنوں کی یاد کو تازہ کر دیتے ہیں اس لیے اسے آج بھی لکھا اور دلچسپی لے لے کر پڑھا جاتا ہے جب کہ آج ہمارے پاس طرح طرح کے سوشل میڈیا پلیٹ فارم اور یوٹیوب وغیرہ ایسے ذرائع ہیں جہاں پر مختلف اسفار کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ اردو کا پہلا سفر نامہ عجائبات فرنگ ہے جسے یوسف خان کمبل پوش نے برطانیہ جانے کے دوران لکھا اور ایسا لکھا کہ تب سے لے کر آج تک سینکڑوں سفر نامے لکھے جا چکے ہوں گے۔ یہ طویل فہرست ہے جس کا یہاں پر ذکر نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اطمینان ضرور دیا جا سکتا ہے کہ اس صنف میں اب بھی مصنف طبع آزمائی کرتے ہیں۔

سفر نامہ کے اجزا میں مندرجہ بالا بتائی گئی باریکیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ کوئی شعری صنف تو ہے نہیں جس میں بحر و وزن سے کوئی سروکار ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں بیانیہ نثر سے کام لیا جاتا ہے اور نثر بھی شگفتہ اور فن کاری سے لبریز ہوتی ہے۔ بات میں سے

بات بھی نکالی جاتی ہے اور بزلہ سنجی سے بھی اکثر کام لیا جاتا ہے اور اشعار بھی موقع و محل کے اعتبار سے پیش کر دیے جاتے ہیں جس سے بات میں وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ ان تمام خصوصیات سے ہی سفر نامہ کی شناخت جڑی ہوئی ہے۔

8.3 سر سید کی سفر نامہ نگاری

سر سید نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کیا تھا اور ان کی رودادیں بھی ان کے لکچروں یا مضامین میں اکثر مل جاتی ہیں لیکن باقاعدہ طور پر مکمل کتابی صورت میں جو سفر نامہ وجود میں آیا وہ مسافران لندن ہی ہے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں قسطوں میں شائع ہوا پھر اس کے بعد مکمل کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ کوئی بھی سفر نامہ نگار اپنی ذہنی سطح، اپنے سروکار اور اپنی ترجیحات کی بنیاد ہی پر واقعات اور حالات کا ذکر کرتا ہے۔ کوئی سفر نامہ نگار محض تفریحی مقامات کا ذکر کرتا ہے، کوئی خوبصورت عورتوں اور وہاں کی زبان اور تہذیب ہی کا ذکر کرتا ہے، کسی سفر نامہ نگار کا مطمح نظر فحش نگاری تک ہی محدود ہوتا ہے تو کوئی بزلہ سنجی سے کام لیتا ہے۔ کچھ سفر نامہ نگار ایسے سنجیدہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ تعلیمی اداروں، یونیورسٹیوں اور لائبریریوں کا تذکرہ کثرت سے اپنے سفر ناموں میں کرتے ہیں۔ سر سید بھی ان میں سے ایک ہیں انہوں نے اپنے لندن کے سفر کے دوران جن جن ممالک سے گزرے وہاں کے ان مقامات کا تذکرہ کیا ہے جس سے کوئی جدید تعلیم یا اعلیٰ نظام کے بارے میں معلوم ہو سکے۔ مصر کی نہروں اور پیرس کے نگار خانے کے علاوہ لندن کے عجائب خانوں کا ذکر بڑے ہی تفصیل سے کیا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی، انڈیا آفس لائبریری، ایتھٹیم کلب، مدارس نسواں، ارباب کمال کی ملاقات، برٹش میوزیم، انجینئرنگ کی ترقیاں، ونچسٹر کالج، پل کا افتتاح، جنگی جہازوں کی تیاری، توپوں کا داغا جانا، عام کاریگروں کی صنعت کاریاں، جنگی جہازوں کی تیاریاں، لندن کا لبرل ماحولان تمام نکات کو انہوں نے بڑی ہی تفصیل سے پیش کیا اور اپنے ہم وطنوں کو بہت یاد کیا۔ سر سید جدید تعلیم اور تکنیک کے حامی تھے اور اسی لیے وہ ان مقامات کو دیکھنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کے بعد بارہا اپنے ہی ملک کے لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔

"مسافران لندن" ایسی دانشور علمی شخصیت اور ذہین اور قابل قدر شخصیت کے ہاتھوں کی تخلیق ہے جب ہمارے ملک کی حالت کافی خراب تھی۔ چاروں طرف ناخواندگی اور بے سروسامانی کا دور تھا۔ سر سید کے لندن جانے کے پیچھے کا سبب ہی یہی تھا کہ وہ پروفیسر میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب لکھ سکیں لیکن چوں کہ وہ بہت سلجھے ہوئے ذہن کے مالک بھی تھے ایسے میں انہوں نے نہ صرف وہ کتاب لکھی بلکہ وہاں سے اخلاقیات پر پرچہ نکالنے کا عہد کر کے ہی ہندوستان واپس لوٹے تھے۔ ظاہر ہے وہ سیکھنے کی بات کو کسی بھی طرح سیکھ لیتے تھے اور اس معاملے میں وہ قوم یا غیر قوم میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے درمیان نفرت در آئی تھی۔ ایسے میں سر سید جیسی شخصیت ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتی تھی۔ انہوں نے وہاں پر رہنے کے دوران کئی ایسے مقامات کی سیر کی ہے جو علمی یا دیگر سائنسی سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں حتی کہ کئی یونیورسٹی اور کالج اور کئی اداروں کی سیر کی اور اپنی قوم کے لیے نہ جانے کیا کیا منصوبے بنانے لگے۔ سر سید نے مسافران لندن میں انگریزی سرکار کی تعلیمی پالیسیوں اور ان کے بہتر نظام کا بہت قریب سے جائزہ لیا اور یہ پایا کہ ان کی کامیابی کا راز یہی سب صنعت و حرفت، تعلیم و تمدن کا بول بالا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے ملک و قوم کے بارے میں زیادہ فکر مند ہو جاتے تھے اور ان مسائل کے تدارک کے بارے میں غور و فکر کرنے لگتے تھے۔ سر سید کا یہ سفر یوں تو علمی تھا لیکن ایسا کوئی

گوشہ نہیں تھا جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر رہے ہوں۔ اسی لیے انہوں نے اس کتاب میں لندن کے بیشتر مشہور و معروف کالج، یونیورسٹی اور دیگر اداروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مسافران لندن میں سرسید نے دونوں ممالک کے حالات کا تجزیہ کر کے ساتھ ہی اپنے تاثرات بھی پیش کیے ہیں اسی کے ساتھ ہی ایسی ایسی معلومات بھی پیش کر دی ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان عش عش کر اٹھے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں جب یہ کتاب شائع ہوئی ہو گی تو بہت سے لوگوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی ہو گی کیوں کہ لندن جانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور ہر کس و ناکس وہاں جانے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سرسید کو بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور یہاں تک کے انہوں نے اپنے برتن بھی فروخت کر دیے تھے۔ سرسید کا مقصد یہ ہر گز نہیں تھا کہ وہ وہاں کی پر رونق عمارتوں اور اداروں کا خوبصورت نقشہ اپنی کتاب میں کھینچ دیں اور لوگ ان کی نثر کو مزے لے لے کر پڑھیں وہ کبھی بھی نثر کی پروا نہیں کیا کرتے تھے اسی لیے ان کی نثر میں کچھ خامیاں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں لیکن ان کے پیش نظر ان کا مقصد ہوتا تھا۔ سفر ہی اس سافرنامے کو انہوں نے اس لیے لکھا کہ لوگوں کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں۔ صرف ولولہ پیدا کرنا ان کا کام نہیں تھا بلکہ وہ تو عملی طور پر بھی کچھ کرنا چاہتے تھے اور لوگوں کو بھی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے تو اپنے حصے کا کام پوری ایمانداری سے کیا۔ ورنہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسا ادارہ وجود میں ہی نہیں آسکتا تھا کیوں کہ انہوں نے جس مدرسے کی بنیاد رکھی تو اس مضبوطی کے ساتھ رکھی تھی کہ وہ ان کے سامنے ہی کالج میں تبدیل ہو گیا تھا اور وہی کالج ایک دن یونیورسٹی بھی بن سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ یونیورسٹی ان کے جانے کے بعد بنی لیکن ان کے خوابوں کی تعبیر ہو کر رہی۔

سفر نامہ مسافران لندن کی زبان و بیان بھی خوب ہے اور اس زمانے میں جو نثر رائج تھی اس کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ حالاں کہ سرسید نے جب اپنی کتاب آثار الصنادید لکھی تھی تو اس کے پہلے ایڈیشن میں مقفع اور مسجع نثر سے کام لیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے سادہ و سلیس نثر کی طرف توجہ دی اور اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ ان کی نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اردو لکھتے وقت ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے الفاظ بھی اس طرح روانی سے استعمال کر جاتے ہیں جیسے کہ وہ اردو ہی کے الفاظ ہوں۔ اسی طرح مسافران لندن کی زبان بھی سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ایک قسم کا تجسس بھی اپنے اندر نہاں رکھتی ہے جس سے پڑھنے کی طلب بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ان کا خطیبانہ انداز، انوکھی طرز فکر سنجیدہ اور ذہانت بھری زبان اور شگفتہ و سلیس نثر نے سفر نامے کی نثر کو بے حد پر کشش بنا دیا ہے اور ساتھ ہی باریک سے باریک معلومات کا مہیا کرتے جانا بھی ایک ایسی خوبی ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں۔

8.4 مسافران لندن: متن اور تشریح

متن: مسافران لندن

جبل پور سے بمبئی تک تمام جنگل و پہاڑ نہایت بے رونق تھے۔ بجز آنبہ کے درختوں کے اور کسی درخت میں ایک پتہ بھی نہ تھا صرف سوکھی سوکھی سنٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ گھاس بھی خشک ہو گئی تھی سارے جنگل و پہاڑ نہایت بھیانک اور وحشت خیز معلوم ہوتے تھے مگر لوگ کہتے ہیں کہ برسات میں اور اچھے موسم میں بہت خوشنما اور سرسبز ہوتے ہیں۔

تمام مسافر فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے جو بمبئی جاتے ہیں وہ ایک اسٹیشن ورے یعنی بیکلا اسٹیشن پر اترتے ہیں کہ یہاں سے ہوٹلیں اور شہر قریب پڑتا ہے اس لیے ہم بھی بیکلا اسٹیشن تک کا ٹکٹ لیا تھا اور وہیں اترے، جوں ہی ہم اسٹیشن میں داخل ہوئے ہم نے اپنے مہربان دوست مسٹر نوروجی پارسی اور اپنے شفیق مرزا محمد علی بیگ کو اسٹیشن پر کھڑا پایا۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ادھر ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوئے ادھر وہ ہم کو دیکھ کر خوش ہوئے مگر جب گاڑی پر سے اترے اور دیکھا کہ مرزا محمد علی بیگ بسبب ناموافقت آب وہوائے ناگپور و بمبئی بہت دبلے و نحیف ہو گئے ہیں اور ان کا دل بھی ہشاش بشاش نہیں ہے بلکہ نہایت افسردہ و پژمردہ ہیں تو ہم کو نہایت رنج اور افسوس ہوا۔ مسٹر نوروجی نے ہم پر بڑی مہربانی کی فوالد فور اسباب ہمارا ایک اپنے آدمی کی سپردگی میں اور چھکڑے پر لدوا کر ہوٹل کو روانہ کیا اور دو گھوڑوں کی پالکی گاڑی ہمارے لیے موجود تھی اور وہ خود ہمارے ساتھ ہوئے اور پالن جی کے ہوٹل میں پہنچا دیا۔

پالن جی ہوٹل نہایت عمدہ و معزز اور بہت بڑا ہوٹل ہے فرش فروش سے آراستہ ہے سونے کے لیے عمدہ عمدہ پلنگ اور پردہ دار مسہریاں لگی ہوئی ہیں۔ ہر کمرہ میں اور ہر جگہ گیس کی روشنی ہوتی ہے۔ جائے ضرور اور غسل خانہ سب ولایت انگلستان کے نمونے پر بنا ہوا ہے۔ ہر ایک جگہ پمپ اور نل کے ذریعے دو منزلہ وسہ منزلہ مکانوں میں بھی از خود پانی پہنچتا ہے۔ خدمتی، حاضر باش اور غریب فرمانبردار اور اپنے کاموں میں ہوشیار ہیں مگر سب کے سب ہندوستانی عیسائی ہیں۔ محمد محمود نے ان سے کہا کہ ہمارے لیے بغیر ذبح کی ہوئی مرغی مت پکانا، انہوں نے کہا کہ ہم ہمیشہ مرغی و کبوتر ذبح کر کر پکاتے ہیں اور باقی گوشت مسلمان قصائی لاتا ہے۔ ہر وقت ہوٹل میں متعدد قسم کا عمدہ کھانا تیار رہتا ہے۔ بہت سے انگریز بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے دو کمرے اس ہوٹل میں لیے، چار پلنگ ان میں آراست ہوئے، ہم وہاں نہائے، دھوئے، کپڑے بدلے اور میں اور حامد اور مرزا خداداد بیگ دو گھوڑوں کی گاڑی میں سوار ہو کر شہر و بازار کو روانہ ہوئے۔

اول ہم گنیشی داس کشنا جی کی دکان پر گئے اور ان کے گماشتہ کو ہنڈیاں دے کر روپیہ چاہا، مالک کوٹھی وہاں نہ تھے گماشتہ نے نوٹ اور ہنڈیاں ایک برہمن کے سپرد کر کر ہمارے ساتھ کیا کہ سیٹھ جی کے پاس لے جاؤ، جو قلعہ کی کوٹھی میں گئے ہیں چنانچہ ہم وہاں گئے۔ سیٹھ جی بہت خاطر تواضع اور اخلاق سے پیش آئے اور ہنڈیوں پر بھر پائے لکھوا کر نوٹ ہمارے حوالے کیے اور ایک آدمی دیا کہ ہم کو پی اینڈ او کمپنی کا جہاز کا دفتر بتلا دے، ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کمپنی کے دفتر میں آئے۔ وہاں کے مینیجر صاحب نے چند خطوط و چٹھیاں وغیرہ کاغذات جو احباب نے ہمارے نام ان کے پتے سے بھیجے تھے سب حوالے کیے۔ ہم نے نوٹ کرایہ جہاز کے ان کو دیے اور چٹھی، رسید، کرایہ جہاز اور ٹکٹ ہائے ریل، علمداری مصر جو سوئزر سے اسکندریہ تک پڑے گی ان سے لے لیے۔

مصر کی ریل کے ٹکٹ انگریزی میں چھپے ہوئے بطور بیاض کے مینجر صاحب کے پاس موجود تھے صرف نام کا خانہ خالی تھا اور اس پر ڈائریکٹر ریلوے مصر کی مہر عربی زبان و عربی خط میں ثبت تھے ہم نے ہر چند کوشش کی کہ اس مہر کو پڑھیں مگر ہم سے نہیں پڑھی گئی غالباً اس میں یہ الفاظ ہیں: "عموم المرور والسکہ"

مینیجر صاحب نے ان پر ہمارا نام لکھ کر ہم کو دے دیا اور نصف مثنیٰ بیاض میں لگا رکھا۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ سفید رنگ کا اور سکنڈ کلاس کو جو چھجو کے لیے لیا ہے، سرخ رنگ کا ہے ہمارے پاس الہ آباد کے نوٹ تھے۔ ہم نے وہ دینے چاہے، مینیجر صاحب نے کہا اول ان کو ٹریژری سے بدلوالو وہاں بغیر پتہ کے بدل جاویں گے، تب بمبئی میں خرچ کرنا۔

شام کے وقت میں اور محمود اور مرزا خداداد بیگ پھر سوار ہوئے اور بھنڈی بازار میں مرزا محمد علی بیگ صاحب سے ملنے کو گئے ان سے ملاقات ہوئی اور ہم سب ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھ گئے اور بازار کے اور لوگوں کے آنے جانے کی سیر دیکھا کیے وہاں میر اشرف علی ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے ہمارا وطن اور یہ کہ ہم کہاں جاتے ہیں پوچھا جبکہ انہوں نے جانا کہ ہم دلی کے رہنے والے ہیں تو انہوں نے دلی کے لوگوں کا حال پوچھا اور سید الاخبار کا جو ایک زمانہ میں ہمارے ہاں سے باہتمام سید عبد الغفور پدر حافظ عبد الرازق مہتمم اخبار سین ٹیفک سوسائٹی نکلتا تھا ذکر کیا اور کہا سید احمد ایک شخص دلی میں تھے جنہوں نے رسالہ تسہیل فی اعمال جز الثقیل اور رسالہ نتائج الافکار فی اعمال الفرجار اور آثار الصنادید لکھی ہے اور جو جواد الدولہ ان کا خطاب تھا اب وہ کس طرح ہیں اور کہاں ہیں۔ میں نے کہا فضل الٰہی سے بہت خوش و خرم ہیں اور آپ کے سامنے بیٹھے ہیں وہ دفعتاً کھڑے ہو گئے اور نہایت خوشی اور شوق سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہوئے اور دیر تک کچھ ریاضی کے اوپر کچھ مسائل فقہ کے اور تقلید وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔

اسی دکان کے قریب ایک مسجد ہے جو نواب کی مسجد کہلاتی ہے اس میں مغرب کی نماز کی اذان ہوئی، ہم لوگ نماز کو اٹھے اور محمود بھی نماز کے لیے ہمارے ساتھ ہو اچلتے وقت مجھ کو خیال ہوا کہ قطعہ اور وضع لباس دیکھ کر ضرور لوگ متعجب ہوں گے مگر وہاں دیکھا کہ بہت سے آدمی ہماری سی سرخ ترکی ٹوپی پہن بیٹھے ہیں اتنا تو لوگوں نے دیکھا کہ کوئی شخص نماز کو آیا مگر اس کے سوا اور کچھ خیال بھی کسی نے کہیں کیا اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ اکثر ترک ان مسجدوں میں نماز کو آجاتے ہیں اور ان کی وضع اور لباس بالکل ہمارا سا ہوتا ہے، اس لیے کسی کو کچھ تعجب نہیں ہوا۔

مسجد کا امام شافعی مذہب تھا، نمازی جو قریب سوا سو ڈیڑھ سو آدمی کے ہوں گے نصف سے زائد شافعی مذہب تھے (شاید ان میں کوئی غیر مقلد بھی ہو) امام کے پیچھے الحمد پڑھتے تھے اور پکار پکار کر آمین کہتے تھے۔ میری بھی خوب بن آئی اور ہم نے اپنے ہم مشربوں کے ساتھ نہایت دلی صدق سے پکار پکار کر آمین کہی۔ حتّٰی احترام المسجد۔ تعجب یہ ہے کہ محمود نے بھی جو اب تک حنفی مذہب کے مطابق نماز پڑھتا ہے پکار پکار کر آمین کہی مسجد سے نکلنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں پکار پکار کر آمین کہی اس نے کہا کہ بہت سے مسلمان کہہ رہے تھے میرے دل نے بھی چاہا میں نے بھی پکار کر کہی، میں نے کہا۔ بارک اللہ و جزاک اللہ و رزقک اللہ تقلید النبی الکریم و نجاک اللہ من التزام تقلید غیرہ فانہ شرک فی صفتہ النبوۃ التی ختمھا اللہ تعالیٰ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 7 مئی 1869)

تشریح و تجزیہ: مسافران لندن

سر سید نے جب سفر لندن اختیار کیا تھا تو انہیں بنارس سے پہلے بمبئی پہنچنا تھا اور پھر بمبئی سے بحری جہاز پر سوار ہونا تھا۔ جبل پور سے بمبئی کے لیے ایکسپریس ٹرین پر سوار ہوئے۔ س دوران انہیں جبل کے کے راستے گزرتے ہوئے کئی جنگل اور پہاڑ بھی دکھائی دیے۔ جنگل میں پت جھڑ کا موسم تھا اس لیے درختوں پر پتے نہیں تھے بلکہ صرف ان کی سنٹیاں یعنی سوکھی ٹہنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لوگوں سے معلوم چلا کہ جب موسم بہار آتا ہے تو یہی جنگل سرسبز و شادماں بھی معلوم ہونے لگتا ہے فی الحال اس پر خذاں کا چھایا ہوا ہے۔

اس ٹرین میں جتنے بھی پہلے اور دوسرے درجے کے مسافر تھے وہ ورے نامی اسٹیشن پر اتر لیتے ہیں تا کہ بمبئی کی بھیڑ بھاڑ سے بچ کر اسی علاقے

میں سکون سے رہ سکیں کیوں کہ اس علاقے میں ہوٹل بھی بہت بڑے بڑے اور کشادہ تھے اور ساتھ ہی دیگر تمام طرح کی سہولیات بھی دستیاب تھیں۔ اس کے علاوہ جب کسی کو بمبئی جانا ہوتا تو وہیں سے بڑی ہی آسانی سے کوئی نہ کوئی تانگا مل ہی جاتا۔ سرسید کے پارسی دوست مسٹر نوروجی اور مرزا محمد علی بیگ انہیں اسٹیشن پر لینے بھی آئے تھے اور انہوں نے لے جا کر ان سب کو ہوٹل پالن جی میں ٹھہرا دیا جو کہ بے حد نئی طرز پر بنا ہوا کافی بڑا ہوٹل تھا۔ اس کا مالک تو پارسی تھا اور اس میں کام کرنے والے بیرے اور دیگر ملازمین ہندوستانی عیسائی تھے۔ سرسید چوں کہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی ساتھ لائے تھے اور چھجو جو کہ ان کی خدمت کے لیے آئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو کمرے بک کیے گئے جن میں چار لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ ان کے بیٹے محمود نے کھانے کے متعلق بھی دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مرغی یا دیگر گوشت حلال ہی استعمال ہوتا ہے اور کوئی مسلم قصائی ہی لے کر آتا ہے یہ تمام معلومات کر لینے کے بعد تسلی کر لی گئی تاکہ کوئی بدمزگی نہ پیدا ہو۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید لاکھ جدیدیت کے متوالے ہوں لیکن انہیں کھانے پینے کی چیزوں میں ان سب باتوں کا خیال تھا۔ ہوٹل میں غسل خانے بھی جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور ان میں ہمہ وقت پانی رہتا تھا جسے ہوٹل کی تمام منزلوں تک چڑھایا جاتا تھا۔ جگہ جگہ پر روشنی کے لیے گیس کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہوٹل کا فرش وغیرہ بھی بے حد نفیس تھا۔ ان لوگوں نے وہاں غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے وہ دو گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر بازار کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں گنیش داس کشنا جی سے ملاقات کی کیوں کہ وہاں پر ہنڈیوں کو نوٹوں میں بدلنا تھا تاکہ وہ لندن جانے اخراجات کے طور پر کام آسکیں۔ گنیش داس جی وہاں نہیں تھے اور ان کے مینیجر نے ہنڈیوں کو کیش کرنے سے منع کر دیا پھر جب سیٹھ جی سے ملاقات ہو گئی تو وہ بہت اخلاق سے ملے اور انہوں نے نہ صرف ان ہڈیوں کے بدلے روپئے دیے بلکہ ایک ایسا آدمی بھی ساتھ کیا جو پی اینڈ او کمپنی کے جہاز کے دفتر تک لے جا سکے۔ سرسید سیٹھ جی کا شکریہ ادا کر کے جہاز کے دفتر کی جانب چلے گئے اور وہاں نوٹ دے کر تمام طرح کے ٹکٹ حاصل کر لیے جن میں جہاز کے ٹکٹ کے علاوہ ٹرین کے ٹکٹ بھی تھے جو مصر اور سوئزر سے اسکندریہ تک تھے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی سیدھا سیدھا سفر نہیں تھا بلکہ اس میں کئی طرح کے سفر تھے۔ جن میں جہاز، ٹرین اور دیگر ذرائع سے اسفار شامل تھے۔ مصر کے ٹکٹ انگریزی میں چھپے تھے لیکن ان پر جو مہر لگی تھی وہ عربی ہی میں تھی جسے سرسید نے متن میں لکھا بھی ہے۔ منیجر صاحب نے تمام طرح کے ٹکٹ سرسید کے حوالے کیے جن میں فرسٹ کلاس ٹکٹ سفید رنگ کا اور سکنڈ کلاس ٹکٹ جو چھجو کے لیے لیا تھا وہ سرخ رنگ کا تھا۔ وہیں پر سرسید نے الہ آباد کے نوٹوں کو بھی بمبئی میں بدلا تاکہ انہیں بمبئی میں خرچ کیا جا سکے۔ شام کے وقت سرسید اپنے بیٹے محمود اور مرزا خداداد بیگ بھنڈی بازار میں مرزا محمد علی بیگ صاحب سے ملنے کو گئے ان سے ملاقات کی وہ سب ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھ گئے اور لوگوں کو آتا جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک بزرگ میر اشرف علی بیٹھے ہوئے تھے ان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے سرسید سے پوچھا کہ آپ کا وطن کیا ہے اور کہاں جائیں گے؟ وغیرہ تو سرسید نے اپنا وطن دہلی بتایا۔ دہلی کا سن کر وہ اخباروں اور کچھ کتابوں کا ذکر کرنے لگے اور انہوں نے سرسید کے بھائی کے اخبار "سید الاخبار" اور کچھ دیگر کتابوں کا ذکر کیا جو سرسید نے خود لکھی تھیں۔ سرسید سنتے رہے اور بعد میں کہا کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔ یہ سن کر وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور بڑی ہی گرم جوشی سے پیش آئے۔ بغل گیر ہوئے اور مصافحہ بھی کیا۔ بعد میں پھر دونوں میں ریاضی کے فقہ اور تقلید پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دکان کے قریب ہی ایک مسجد بھی تھی۔ جہاں سب نے نماز پڑھی۔ مسجد شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی تھی لیکن سرسید نے اس میں نماز ادا کی اور جب نمازی

زور سے آمین کہتے تھے تو سر سید ان کے بیٹے محمود بھی زور سے آمین کہتے تھے۔ حالاں کہ سر سید اسی سفر نامے میں فرماتے ہیں کہ محمود نے اب تک حنفی مذہب کے مطابق ہی نماز ادا کی تھی۔ بہر کیف اس امر سے ان کے secular ہونے اور فرقہ ورانہ جھگڑوں سے دور رہنے کی عادت کا پتا چلتا ہے۔ سفر نامے کا یہ حصہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے جو کہ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے 7 مئی 1869 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس حصے میں سر سید کے بمبئی تک کے سفر کی روداد ہے وہ ابھی ہندوستان سے روانہ نہیں ہوئے ہیں لیکن جبل پور سے بمبئی تک کے سفر میں انہیں جو بھی معاملات در پیش آئے ان تمام کا ذکر بڑی ہی خوش اسلوبی اور شگفتگی کے ساتھ کیا ہے۔ کہیں پر وہ پریشانی کا اظہار نہیں کرتے اور اطمینان سے تمام سفر کی روداد بیان کرتے ہیں۔

8.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- خطبات احمدیہ کتاب پروفیسر میور کی متنازع فیہ کتاب لائف آف محمد کے جواب میں لندن میں جا کر لکھی گئی تھی۔ اسی سبب ان کا لندن جانا ہوا اور پورے سفر کی روداد کو سر سید نے مسافران لندن کے نام سے قلم بند کیا۔
- سر سید نے لندن کا یہ سفر اپنے دونوں بیٹوں اور اپنے ایک ملازم چھجو کے ساتھ طے کیا تھا جس میں کافی رقم بھی خرچ ہوئی، سر سید نے اس سفر کے لیے کافی پریشانیوں کا سامنا کیا تھا۔
- لندن میں سر سید نے اعلا تعلیمی نظام، یونیورسٹی، کالج اور دیگر ادارے دیکھے، ساتھ ہی مختلف صنعت و حرفت کے ذرائع اور مختلف عجائب گھر وغیرہ دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ انگریز قوم کیوں اتنی ترقی پر ہے اور ہم ہندوستانی کیوں کر اتنے پسماندہ ہیں۔
- لندن میں سر سید نے کئی تعلیمی سوسائٹیوں کا جائزہ لیا اور اس کے علاوہ لوگوں میں ایک قسم کی اخلاقیات دیکھی جس کا انہیں ہندوستان میں فقدان نظر آتا تھا۔ انہوں نے وہیں فیصلہ کیا کہ ہندوستان جا کر اخلاقی مجلہ ضرور نکالوں گا جو عوام میں اخلاقیات کے تئیں بیداری پیدا کرے گا۔ یہ پرچہ لندن میں نکلنے والے پرچوں اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر سے متاثر ہو کر نکالا گیا تھا جس کا نام 'تہذیب الاخلاق' رکھا گیا تھا جو کئی آج بھی جاری ہے۔
- سر سید کی نثر بے حد رواں، شگفتہ، سلیس اور تصنعات سے پاک ہے وہ کسی بھی بات کو تفصیل کے ساتھ بلا کسی جھجک اور تکلفات سے کے آسانی سے بیان کر دیتے ہیں۔ یہی ان کی نثر کی خوبی ہے۔
- صنف سفر نامہ میں بیانیہ جتنا ہی عمدگی کے ساتھ پیش کیا جائے گا سفر نامے کی نثر اتنی ہی بہتر مانی جائے گی۔ سفر نامہ کی نثر میں بذلہ سنجی اور معلومات کا ذخیرہ نہاں ہوتا ہے۔ اگر سنجیدہ نثر سے کام لیا جائے جس میں ذرا بھی لوچ نہ ہو اور محض معلومات ہی ہو تب بھی وہ سفر نامہ کامیاب نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ایسی صورت میں وہ پڑھنے والے پر گراں گزرے گا۔
- سفر چاہے طویل ہو مختصر سفر نامہ لکھا جا سکتا ہے لیکن عام طور یہ رواج ہے کہ بیرون ممالک جانے والے ادیب ہی سفر نامہ لکھتے ہیں اور دوسرے ملک کی تمام طرح کی تفصیلات کو ہی نہیں لکھتے ہیں بلکہ وہ قلمی مرقعے بھی پیش کرتے ہیں جس سے وہاں کی عمارتوں،

لوگ باگ، تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کو اپنے ہم وطنوں کو دکھایا جاسکے۔

- سفر نامہ نگار کو متجسس ہونا چاہیے اور کسی بھی بات کی تہہ تک جانے کا جذبہ بھی اسے ایک اچھا سفر نامہ نگار بناتا ہے۔
- اردو کا پہلا سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش نے لکھا تھا اور یہ بھی برطانیہ کے سفر پر مبنی تھا۔ اس میں یوسف خان کمبل پوش نے اپنی مقفع و مسجع نثر کے جوہر دکھائے تھے۔ یہ سفر نامہ اس لیے بھی اہم ہے کیوں کہ یہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے۔ سر سید نے اپنا سفر نامہ سادہ وسلیس زبان میں لکھا جو بہت مقبول بھی ہوا۔

8.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
نان فکشن	:	غیر افسانوی ادب، افسانوی ادب کے علاوہ نثری تحریر
روداد	:	کہانی، واقعہ، گزری ہوئی
بحری	:	سمندری
مقناطیسیت	:	کھنچاؤ
مناظر	:	منظر کی جمع
وسعت	:	پھیلاؤ
سیاح	:	گھومنے والا، مسافر
وسیلہ	:	ذریعہ
حقائق	:	حق کی جمع، سچائی
ترجیحات	:	بہتری، بڑائی
بے سروسامانی	:	ضرورت کی اشیا سے بھی محروم ہو جانا
احباب	:	دوست، یار
گماشتہ	:	منیجر
بذلہ سنجی	:	مزاحیہ
متجسس	:	تجسس رکھنے والا
مقفع و مسجع نثر	:	ایسی نثر جس میں قافیہ اور ہم آہنگ الفاظ استعمال کیے جائیں

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سرسید بمبئی جانے کے لیے کس شہر سے ٹرین ہر سوار ہوئے؟

(a) جبل پور (b) بجنور (c) دہلی (d)ان میں سے کوئی نہیں

2۔ سفر نامہ کو ام الاصناف کس نے کہا ہے؟

(a) سرسید (b) حالی (c) شبلی (d)احمد سعید

3۔ سرسید نے لندن میں انگریزوں کی ترقی کا راز کس میں نہاں پایا؟

(a) چرچ میں (b) تعلیمی نظام میں (c) سنیما گھروں میں (d)ریلوے اسٹیشن پر

4۔ پروفیسر میور نے کون سی کتاب لکھی تھی جس کے سبب سرسید لندن تک چلے گئے؟

(a) قرآن کی تشریح (b) حدیث کا ترجمہ (c) لائف آف محمد (d) اردو گرامر

5۔ مسافران لندن سرسید کی کس نوعیت کی کتاب ہے؟

(a) شاعری (b) ناول (c)ڈائری (d)سفر نامہ

6۔ دوران سفر لندن سرسید کے ساتھ ان کے کتنے بیٹے تھے؟

(a)ان میں سے کوئی نہیں (b) صرف ایک (c) ایک بھی نہیں (d)دونوں

7۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق جیسا عظیم پرچہ نکالنے کے بارے میں کہاں عہد کر لیا تھا؟

(a) لندن میں (b)بنارس میں (c) علی گڑھ میں (d)دہلی میں

8۔ خطبات احمدیہ کس نوعیت کی کتاب ہے؟

(a) روداد (b) سوانحی (c) فقہ کے مسائل (d)شرح

9۔ جس کمپنی کے جہاز سے سرسید نے بمبئی سے سفر اختیار کیا تھا اس کا کیا نام تھا؟

(a) ٹاٹا کمپنی (b) ایسٹ انڈیا کمپنی (c) پی اینڈ او (d)شپنگ کمپنی

10۔ اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر یہ دونوں پرچے کہاں سے نکلتے تھے؟

(a) الہ آباد (b) علی گڑھ (c) روس (d) لندن

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سفر نامہ کی خوبیوں کو مختصراً لکھیے۔

2۔ سفر نامہ مسافران لندن میں سرسید کی نثر پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ ام الاصناف سفر نامہ کو کہا جاتا ہے کیوں؟

4۔ سفر نامہ غیر افسانوی ادب میں بہت اہم صنف ہے کیوں؟

5۔ رسالہ تہذیب الاخلاق نکالنے کے پیچھے کیا وجہ تھی؟

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ سفر نامہ کسے کہتے ہیں؟ تفصیل سے لکھتے ہوئے اس کی خوبیوں کا بیان بھی کیجیے۔

2۔ سر سید لندن میں جا کر انگریز قوم کی کن کن باتوں سے متاثر ہوئے تھے؟ اظہار خیال کریں۔

3۔ سر سید نے دوران سفر جو معلومات پیش کی ہیں ان پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

8.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	مسافران لندن	سر سید احمد خاں (مرتب: پروفیسر اصغر عباس)
2۔	آزادی کے بعد اردو سفر نامہ	احمد سعید
3۔	اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ	مرزا حامد بیگ
4۔	اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ	خالد محمود
5۔	اردو سفر نامے انیسویں صدی میں	قدسیہ قریشی
6۔	سفر نامہ ہند	محمد اسلم

8.7.1 کے جوابات

a۔1	d۔2	b۔3	c۔4	d۔5
d۔6	b۔7	b۔8	c۔9	d۔10

نمونہ امتحانی پرچہ

بی اے (اردو)، چوتھا سمسٹر

پرچہ: سرسید احمد خان

B.A. Urdu 4th Semester

Paper : Sir Syed Ahmad Khan Subject Code : BNUR401DET

وقت: دو گھنٹے Time : 2 hours　　نشانات: 35 Marks

ہدایات:

یہ پرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم اور حصہ سوم۔ تمام حصوں سے جواب دینا لازمی ہے۔

1. حصہ اول کے تمام سوالات لازمی ہیں۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (5 x 1 = 05 Marks)
2. حصہ دوم میں 08 سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی 05 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 4 نمبرات مختص ہیں۔ (5 x 4 = 20 Marks)
3. حصہ سوم میں 02 سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی 01 سوال کا جواب دینا ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (1 x 10 = 10 Marks)

حصہ اول

سوال: 1

i. سرسید کہاں پیدا ہوئے؟

(a) غازی پور　(b) بجنور　(c) دلی　(d) میرٹھ

ii. "تبیین الکلام" کا موضوع کیا ہے؟

(a) ادبی　(b) علمی　(c) مذہبی　(d) سیاسی

iii. سائنٹفک سوسائیٹی کی بنیاد کہاں رکھی گئی؟

(a) بنارس　(b) علی گڑھ　(c) غازی پور　(d) دہلی

iv. سرسید کس کی نثر نگاری سے متاثر تھے؟

(a) حالی　(b) شبلی　(c) اسٹیل وایڈیسن　(d) محمد حسین آزاد

v. "گزرا ہوا زمانہ" سرسید کا کس نوعیت کا مضمون ہے؟

(a) نصیحت آمیز　(b) مزاحیہ　(c) مذہبی　(d) واعظانہ

حصہ دوم

2۔ سرسید کے آباواجداد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

3۔ سرسید کی صحافتی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

4۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصد واضح کیجیے۔

5۔ سرسید سے قبل اردو نثر کی صورت حال بیان کیجیے۔

6۔ مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' کا خلاصہ پیش کیجیے۔

7۔ سرسید احمد خان نے مضمون "کاہلی" میں کاہلی کی کیا تعریف کی ہے؟ وضاحت کیجیے۔

8۔ سفر نامہ مسافران لندن میں سرسید کی نثر پر اظہار خیال کیجیے۔

9۔ "اسباب بغاوت ہند" لکھنے کے پس پشت سرسید کے کیا مقاصد تھے؟

حصہ سوم

10۔ عہدِ سرسید کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔

11۔ سیرت کے حوالے سے سرسید کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

*****